تنقیدی و تحقیقی مقالہ (برائے ایم فِل اُردو)

اشرف نقوی کی ادبی خدمات

وجیہہ زہرا زیدی

(سیشن 2017-2015ء)

شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف سرگودھا

دی نوبلز کالج آف ایجوکیشن، مخدوم رشید، ملتان

انتساب

شوہر علی رضا زیدی، والد آفاق زیدی اور سُسر بختیار حسین زیدی

کے نام

جن کی بھرپور حوصلہ افزائی اور قدم قدم پر رہنمائی کے باعث مَیں یہ منزل سر

کرنے میں کامیاب ہوئی

فہرست ابواب

باب نمبر ا

''اشرف نقوی کی سوانح و شخصیت''

اشرف نقوی کا تعلق ترمذ کے ایک سادات گھرانے سے ہے اور سلسلۂ نسب دسویں اِمام، اِمام علی نقیؑ سے ملتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد بھی دوسرے عرب خاندانوں کی طرح ہجرت کر کے ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئے تھے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے مشرقی پنجاب کے مشہور شہر انبالہ کی تحصیل شاہ آباد کے ایک گاؤں دینار پور میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے پڑ دادا کے والد سیّد بہار علی ایک بڑے زمیندار تھے۔

ان کے پڑ دادا کا نام سیّد منصب علی تھا جن کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام سیّد رشید حسین تھا جبکہ اُن کے منجھلے بیٹے کا نام سیّد مجید حسین تھا۔ سیّد احمد حسن سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔

سیّد مجید حسین اشرف نقوی کے نانا اور سیّد احمد حسن دادا تھے۔ ان کی والدہ کا نام رضیہ بیگم اور والد کا نام سیّد دلبر حسن تھا۔ قیامِ پاکستان کا اعلان ہوتے ہی پورے ہندوستان کی طرح مشرقی پنجاب میں بھی بدترین ہنگامے پھوٹ پڑے اور مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا تو دینار پور پر بھی سکھوں نے حملہ کر دیا۔ گاؤں کے تمام باسیوں کو راتوں رات اپنی جانیں بچا کر نکلنا پڑا اور وہ کئی دن اور راتیں کیمپوں میں گزار کر پاکستان آ گئے۔ پاکستان آ کر آبادکاری تک کچھ عرصہ مہاجر کیمپوں میں گزارنا پڑا۔ پھر ان کے والدین جہلم میں آباد ہو گئے لیکن تلاشِ روزگار کے سلسلے میں پہلے گوجرانوالہ اور پھر شیخوپورہ آ گئے اور ڈسٹرکٹ کونسل میں ملازمت کے حصول کے بعد مستقل طور شیخوپورہ میں ہی آباد ہو گئے۔

اشرف نقوی کی پیدائش شیخو پورہ میں 6 مئی ، 1962 ء اتوار کے دن بوقت صبح صادق ہوئی۔ بلدیہ کے ریکارڈ میں ان کا نام اشرف حسین تھا جبکہ سکول میں داخلے کے وقت محمد اشرف درج کروایا گیا۔

جیسا کہ اوپر والی سطور پر بیان کر چکی ہوں کہ ان کے والد کا نام سیّد دلبر حسن نقوی تھا لیکن دلبر شاہ کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے اور دسٹرکٹ کونسل میں ملازمت مکمل کر کے ریٹائر ہوئے ۔ان کا انتقال یکم اگست ، 2010 ء کو ہوا۔ ان کی والدہ رضیہ بیگم ایک گھریلو خاتون تھیں جو کہ 7۔ اپریل، 1991 ءکو اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

اشرف نقوی کے بہن بھائیوں کی اگر بات کی جائے تو ان کے چار بہن بھائی ہیں۔ایک بھائی اور بہن ان سے بڑے اور دو بہن بھائی ان سے چھوٹے ہیں۔سب سے بڑے بھائی سیّد مظفر حسین نقوی ہیں جو کہ محکمہ آب پاشی کی ملازمت سے 2015 ء میں ریٹائر ہوئے اور آج کل لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔ان سے بڑی بہن شاہدہ پروین ہیں جو خاتونِ خانہ ہیں۔ان کا چھوٹا بھائی سیّد مشرف حسین ضلع کونسل شیخو پورہ میں ملازمت کر رہا ہے جب کہ سب سے چھوٹی بہن سیّدہ ساجدہ پروین بھی شادی شدہ ہیں اور بھکر میں رہائش پذیر ہیں۔

ان کی تعلیم کا آغاز بھی ہر مسلم گھرانے کے بچوں کی طرح دینی تعلیم سے ہوا۔ چار پانچ سال کی عمر میں محلّے کی قریبی مسجد میں قرآنِ پاک پڑھنے کے لیے بھیجا گیا۔تقریباً اِسی عمر میں ان کو ایم سی پرائمری سکول محلہ مسلم گنج میں بھی داخل کروا دیا گیا۔ چونکہ ان کے والدِ محترم دینی رُجحان رکھتے تھے۔ اِس لیے اُنھوں نے اشرف نقوی کو قرآن حفظ کروانے کا فیصلہ کیا اور پرائمری تعلیم کے دوران ہی سکول سے ہٹا لیا گیا اور شیخو پورہ کے معروف اُستاذ الحفاظ ، حافظ ارشاد احمد کے مدرسے میں ، جو اُنھوں نے گھر میں ہی قائم کیا ہوا تھا، داخل کروا دیا گیا۔

بقول اشرف نقوی قرآن مکمل کرنے کے بعد دوبارہ تعلیمی سلسلہ شروع ہوا اور مجھے

گورنمنٹ جامع ہائی اسکول کے ایک نہایت قابل اور محنتی اُستاد محترم محمد خان نسیم مرحوم کی شاگردی میں دے دیا گیا جنھوں نے صرف ڈیڑھ سال کے عرصے میں اس قابل بنا دیا کہ میٹرک کے امتحان میں بیٹھ سکوں۔ چنانچہ 1981ء میں میٹرک کے سالانہ امتحان میں شرکت کی اور درجہ دوم میں کامیابی حاصل کی۔ بعدازاں گورنمنٹ کمرشل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (موجودہ گورنمنٹ گریجویٹ کالج آف کامرس) شیخوپورہ میں داخلہ لیا اور 1983ء میں پنجاب بورڈ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن لاہور سے ڈپلومہ ان کامرس (ڈی کام) کا امتحان پاس کیا۔

1984ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج شیخوپورہ (موجودہ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج) میں تعلیم حاصل کی اور 1986ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ والد صاحب کے مالی حالات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے مزید سلسلۂ تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور ملازمت کے حصول کے لیے جدوجہد شروع کردی۔ اِسی دوران 1989ء میں سی ٹی کا امتحان پاس کیا۔ 1993ء میں بی ایڈ اور 1997ء میں بالترتیب ایم اے پنجابی زبان وادب کا امتحان پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بطور پرائیویٹ امیدوار پاس کیا۔

گریجویشن کے بعد کچھ عرصہ بے کار گزارنا پڑا۔ بعدازاں پرائیویٹ ملازمت سے سلسلۂ روزگار کا آغاز ہوا۔ 1988ء میں ملک پیک لیمیٹڈ (موجودہ نیسلے ملک پیک) میں بطور سٹور کلرک بھرتی ہوگئے لیکن 1989ء میں تقریباً ایک سال کے بعد استعفیٰ دے دیا اور اپنے والد صاحب کے ساتھ دُکانداری میں اُن کا ہاتھ بٹانا شروع کردیا۔

نومبر، 1990ء میں محکمہ تعلیم میں بطور ای ایس ٹی (EST) تقرری ہوگئی۔ ان کی پہلی تقرری گورنمنٹ ایلیمنٹری سکول بھٹھل میں ہوئی۔ تقریباً دس سال بعد گورنمنٹ ایلیمنٹری سکول جیون پورہ خورد میں تبادلہ ہوگیا۔ جولائی 2005ء میں بطور ایس ایس ٹی پروموشن کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول بلہڑ کے میں تقرری ہوگئی۔

2007ء میں بطور ڈسٹرکٹ ٹیچر ایجوکیٹر (DTE) کلسٹر ٹریننگ اینڈ سپورٹ سنٹر (CTSC) گورنمنٹ ہائی سکول ساہوکی ملیاں میں تعیناتی ہوگئی۔ 2011ء تک بطور DTE فرائض سرانجام دینے کے بعد گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول شیخوپور میں تعیناتی ہوگئی اور دسمبر، 2015ء میں گورنمنٹ ہائی سکول بھکھی میں تبادلہ ہوگیا۔تب سے تاحال وہیں اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہے ہیں۔

ان کی شادی کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو ان کی شادی 9۔نومبر، 1991ء کو سیّد محمد حمید حسین بخاری کی صاحبزادی روبینہ حمید بخاری سے ہوئی۔ سیّد محمد حمید حسین بخاری خود بھی گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول شیخوپورہ میں ایس ایس ٹی تھے۔

اُن کے چھوٹے بھائی پروفیسر سیّد خورشید حسین بخاری معروف ادیب، محقق اور ماہرِ تعلیم تھے۔اشرف نقوی کی شریکِ حیات روبینہ حمید بخاری بھی شاعری سے شغف رکھتی ہیں اور روبینہ بخاری کے قلمی نام سے لکھتی ہیں۔غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کرتی ہیں۔ان کا کام کچھ ادبی رسائل و جرائد میں شائع بھی ہوچکا ہے۔

اشرف نقوی کے بچوں کی تعداد تین ہے۔سب سے بڑا بیٹا ہے جس کا نام سیّد محمد حسنین احمد نقوی ہے۔20۔جنوری، 2002ء کو پیدا ہوا۔اِس وقت جماعت نہم کا طالب علم ہے۔دوسرے نمبر پر بیٹی ہے جس کا نام سیّدہ وجیہہ زینب نقوی ہے۔اس کی تاریخ پیدائش 22 جنوری، 2003ء ہے ۔وہ بھی جماعت نہم کی طالبہ ہے۔تیسرے نمبر پر بھی بیٹی ہے جس کا نام سیّدہ شافعہ بتول ہے۔اس کی 12۔ستمبر 2006ء کو ہوئی۔شافعہ بتول جماعت پنجم میں زیرِ تعلیم ہے۔

اشرف نقوی صاحب کی سماجی اور ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کے زمانۂ طالب علمی سے ہی ان کا آغاز ہوگیا تھا۔اُس دور میں تعلیمی اِداروں میں سٹوڈنٹس یونینز فعال تھیں اور ہر سال باقاعدگی سے سٹوڈنٹس یونینز کے الیکشن ہوا کرتے تھے۔کمرشل کالج میں سالِ اوّل

(سیشن 82-1981ء) کے دوران بطور کلاس نمائندہ منتخب ہوئے اور سال دوم میں بطور نائب صدر سٹوڈنٹس یونین منتخب ہوئے۔

کھیلوں اور ہم نصابی سرگرمیوں کے سالانہ مقابلے ہر سال تعلیمی اِداروں میں باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں۔1983ء کے سالانہ کُل پنجاب بین الکلیاتی مقابلے گورنمنٹ کمرشل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، وحدت روڈ، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور میں منعقد ہوئے تو اشرف صاحب نے اپنے ساتھی طالب علم کے ساتھ اپنے کالج کی نمائندگی کرتے ہوئے نظم و غزل کے مقابلے میں حصہ لیا اور انفرادی طور پر سیکنڈ پوزیشن اور بحیثیت ٹیم ٹرافی حاصل کی۔

اِس طرح 1982ء میں اپنے ایک ہم جماعت شاعر قمر علی خان پرنس کے ساتھ مل کر ''پرنس رائٹرز ایسوسی ایشن'' کی تشکیل کی اور اس کے زیرِ اہتمام ایک دو پروگرام اور مقامی سطح کے مشاعرے بھی منعقد کرائے۔ بعد میں اس کا نام تبدیل کر کے ''نوجوان ادبی محاذ'' رکھ دیا گیا اور یہ تنظیم کئی سال تک فعال رہی۔ اِس کے کریڈٹ پر کئی یادگار مشاعرے اور پروگرام ہیں۔ 1984ء میں نوجوانوں کی ایک ملک گیر فلاحی و سماجی تنظیم ''یوتھ فرنٹ پاکستان'' کے شیخوپورہ یونٹ کی بنیاد رکھی گئی۔ اشرف نقوی نے اس تنظیم میں بطور جنرل سیکرٹری اور نائب صدر کام کیا اور فلاحِ عامہ کے کئی منصوبوں میں عملی طور پر حصہ لیا۔

''یوتھ فرنٹ'' کے کریڈٹ پر بھی کئی یادگار پروگرام ہیں، خصوصاً تحریکِ پاکستان کے حوالے سے۔ جن میں اُس وقت کی نامور سماجی اور سیاسی شخصیات شرکت کرتی تھیں۔ اُنھی دِنوں شیخوپورہ میں ایک ادبی تنظیم ''انجمن شاہینِ ادب'' متحرک تھی جس کے بانی اور آرگنائزر خالد محمود تھے۔ ارشد نعیم اس میں غالباً سیکرٹری نشر و اشاعت تھے۔ خالد محمود کی ذاتی مصروفیات کی بِناء پر ''انجمن شاہینِ ادب'' کچھ عرصہ کے لیے غیر فعال ہوگئی تو ارشد نعیم نے اسے دوبارہ فعال کرتے ہوئے اس کی تشکیلِ نو کی اور اس کا نام ''شاہین رائٹرز فورم رکھ دیا۔ اشرف نقوی بطور جوائنٹ سیکرٹری اس تنظیم

کا حصہ رہے۔

1989-1990ء میں نوجوان شعراء، نوید رضا، کامران انجم، اطہر سجاد اور ناصر عباس وغیرہ نے ''نقوشِ ادب'' کے نام سے ادبی تنظیم قائم کی تو اس میں بھی انھوں نے ایک سال کے لیے بطور صدر اور ایک سال کے لیے بطور جنرل سیکرٹری فرائض انجام دیے۔ بعد میں اِسی تنظیم کو ''دریچہ'' کے نام سے فعال کیا گیا تو اِس تنظیم کے بنیادی ارکان میں ارشد نعیم، اشرف نقوی، اشفاق احمد وِرک (ڈاکٹر)، خالد ندیم (ڈاکٹر)، نوید رضا، شاہین عباس، پروفیسر اکرم سعید، پروفیسر خرم عباس وِرک اور اظہر عباس شامل تھے۔

بعد میں اِبنِ صادق مزاری، ابرار حامد، اصغر علی جاوید، پروفیسر صدیق شاہد، سیّد انتصار حسین عابدی، نعیم گیلانی، محمد اکرم سُرا، علی آصف اور محمد نعیم مجوکہ بھی ''دریچہ'' کا حصہ بن گئے۔ اشرف نقوی پہلی بار 2003-2004ء میں اشفاق احمد وِرک (سیکرٹری ''دریچہ'') کے ساتھ بطور جوائنٹ سیکرٹری منتخب ہوئے اور دوسری بار دسمبر، 2015ء میں ارشد نعیم (سیکرٹری ''دریچہ'') کے ساتھ منتخب ہوئے اور تا حال اِس عہدے پر کام کر رہے ہیں۔ اِس کے علاوہ ''انجمن اساتذہ پاکستان'' شیخوپورہ کے ضلعی نائب صدر اور جنرل سیکرٹری کے عہدے پر بھی کام کیا اور ہیومن رائٹس ویلفیئر سوسائٹی شیخوپورہ کے ممبر ہیں اور بطور ایڈیشنل جنرل سیکرٹری کام کر چکے ہیں۔

اشرف نقوی کی شاعری کا بغور جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے بقول اُن کے ،شاعری کا آغاز اُس وقت کیا جب ان کی عمر پندرہ سال تھی اور وہ سال 1977ء کا تھا۔

بقول اشرف نقوی:

''تحریکِ نظامِ مصطفی کا زمانہ تھا اور سیاسی شعری اُفق پر سیّد امین گیلانی اور اُن کے صاحب زادے سیّد سلمان گیلانی چھائے ہوئے تھے۔ اُن کی سیاسی نظموں نے مجھے لکھنے پر اُبھارا۔ ظاہر سی بات ہے جو بچہ شاعری کی الف ب سے بھی واقف نہ ہو، وہ کیا شاعری کرے گا۔ بہر حال میری پہلی کاوش 1977ء کی تک بندی ہی ٹھہری۔

1981ء میں باقاعدہ شعر کہنے کا آغاز کیا۔ گو کہ وزن، تلفظ اور بحور کے مسائل اپنی جگہ پر تھے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میری شاعری میں نکھار 1991ء کے بعد آیا۔ مَیں نے اپنی زندگی کا مشاعرہ 1983ء میں پڑھا تھا جو صنعت زار شیخو پورہ میں منعقد ہوا تھا اور یہ کُل پنجاب مشاعرہ تھا اور اس کی صدارت پروفیسر عبدالجبار شاکر مرحوم کی تھی۔''

ادبی رسائل و جرائد میں چھپنے کا آغاز 97-1996ء سے ہُوا۔ ملک کے معروف جرائد میں تسلسل سے ان کی شاعری شائع ہو رہی ہے۔ یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ اشرف نقوی نے شاعری کی جن اصناف پر طبع آزمائی کی ان میں زیادہ تر کام ''غزل'' پر ہے۔ جبکہ حمد، نعت، سلام، منقبت اور نظم میں بھی کچھ کام کیا ہے۔ اُردو کے علاوہ پنجابی میں بھی کبھی کبھار شعر کہہ لیتے ہیں۔

تصانیفِ اشرف نقوی:

اشرف نقوی کی تصانیف میں اب تک دو شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔

(1)۔ آخرش — مطبوعہ 2006ء — مجموعۂ غزل

(2)۔ زادِ حرف — مطبوعہ 2015ء — مجموعۂ غزل

جب کہ تیسرا شعری مجموعہ ابھی زیرِ ترتیب ہے اور جلد شائع ہوگا۔ ''آخرش'' کا مقدمہ ''اے مخاطب'' کے نام سے شاہین عباس نے لکھا۔ شاہین عباس نے اشرف نقوی کے اُسلوب اور شعری جائزہ کو اِس مقدمہ میں بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اُنھوں نے غزل کی تعریف اور شعر گوئی کے حوالے سے نہایت خوب صورتی سے وضاحت کی ہے۔

شاعری میں وزن کا التزام عربی زبان کا مرہونِ منت ہے۔ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل تک بھی زمانۂ قدیم کی کسی بھی زبان میں شعر گوئی کے لیے اوزان کا لزوم نہیں تھا۔ درحقیقت ادبیاتِ عالم میں موزوں شاعری کی تخلیق کا سہرا اسلامی کلچر کے سر جاتا ہے۔ ازمنہ قدیم میں عبرانی، سریانی اور فارسی میں بھی بحر و وزن کا کوئی تصوّر نہیں تھا۔ اُردو زبان کے عروض میں بھی عربی بحور ہی کارفرما ہیں۔

تاہم زیادہ تر بحریں عربی کے لیے مخصوص ہیں۔لگ بھگ 9 بحروں کے اوزان اُردو شاعری کے مزاج سے میل کھاتے ہیں۔

فنِ عروض شاعری کے وقیع فنون کا ایک اہم اور لازمی حصہ ہے۔تاہم بحر و وزن کو جانچنے کا اور تقطیع کرنے کا مرحلہ کافی اہم ہے۔سب سے پہلے قوتِ متخیّلہ، مطالعۂ کائنات اور ذخیرۂ الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔موجودہ دَور میں رموزِ شاعری سے واقفیت حاصل کرنے کا رُجحان دم توڑتا جا رہا ہے، جبکہ یہ فنونِ لطیفہ کا عظیم وِرثہ ہے اور اِس ورثہ کی حفاظت ہم اُردو والوں کی ذِمہ داری ہے۔
شاہین عباس کے مطابق:

> ”شعر گوئی کا عمل اپنے اصل عناصر کے اعتبار سے، خیر و خبر کی سی زندگی بخش فضا سے مسلسل اور متواتر ہم آہنگی کا نام ہے۔غزل کی اصلیت اپنے احوال و آثار کی حدود میں تاریخ وتہذیب کی ہم قدم بھی ہے اور ہم سر بھی۔یوں دیکھا جائے تو غزل کہنا محض رسم نبھانا یا آواز ملانا نہیں بلکہ یہ تو زندگی کی گواہی دینے کا نام ہے۔ایسی گواہی جو کہ سفر اور وقت کے مابین موجود تعلق میں اضافے اور اثبات کا بیانیہ ہو اور جو تخلیقی عمل کو محض جذبات نگاری کے سرسری پن سے بلند تر کوئی ہونی احساس کی سریت اور فکر کے اعماق تک لے جائے۔

اشرف نقوی ایک انتہائی خوب صورت اور خوب سیرت شخصیت، پُروقار، معتدل مزاج، صاف گو، حکمت و ہُنر کے مالک ہیں۔وہ ایک محنتی، جفاکش اور شفیق اُستاد ہیں۔اپنے طالب علموں کے ساتھ ان کا رویّہ بہت مشفقانہ ہوتا ہے۔اشرف نقوی علم وفن کے اعتبار سے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔تعلیمی ڈگری کے حصول کے باوجود ان کی علمی وتحقیقاتی تشنگی کم نہیں ہوئی۔وہ نہ صرف تسلسل اور تواتر کے ساتھ مضامین اور اشعار قلم بند کر رہے ہیں بلکہ کتابیں بھی شائع کروا رہے ہیں۔

اشرف نقوی ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔بچپن ہی سے محنت ان کے خون میں رچی بسی ہے۔اُن کے والد نے محنت اور حلال کی کمائی سے اپنے بچوں کی پرورش کی۔بی اے کرنے کے بعد اشرف نقوی کے مالی حالات اِتنے اچھے نہیں تھے کہ آگے تعلیم کو جاری رکھ سکتے۔اِس لیے

اُنھوں نے ملازمت اختیار کر لی اور چھوٹے سے پرائیویٹ سکول میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے کر اپنے گھر کا بوجھ بانٹا اور ساتھ ساتھ اپنا تعلیمی سلسلہ بھی آگے بڑھایا۔ (وضاحت: ملازمت پرائیویٹ سکول میں نہیں بلکہ سرکاری سکول میں کی تھی؛ اشرف) اشرف نقوی کو شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ کالج کے زمانے میں یہ ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کے اساتذہ ان کی شاعری کی نوک پلک سنوارتے تھے۔ ان کے اندر خوب سے خوب تر کی تلاش کی جستجو پیدا ہو گئی جو کہ ان کو ایک بڑے ادبی پلیٹ فارم پر لے آئی۔ جہاں سے اپنے اشعار سامعین کو سُنا کر داد وصول کرتے ہیں۔ ادبی تنظیم ''دریچہ'' ان کی ادبی کاوشوں کا نتیجہ ہے جہاں وہ باقاعدگی سے مشاعروں میں حصہ لیتے ہیں اور جوائنٹ سیکرٹری کی حیثیت سے تنظیم کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں۔

اشرف نقوی گزشتہ کئی سالوں سے اخبارات اور ادبی رسائل میں بھی لکھ رہے ہیں اور ان کا کلام باقاعدگی سے ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں چھپ رہا ہے۔ ان کا اُسلوب دل کش ہے اور شاعری میں نیاپن ہے۔ اشرف نقوی نے ''زادِ حرف'' میں ''خود کلامی'' کے نام سے لکھا ہے:

> ''مَیں کون ہوں! اِس سوال کا جواب مجھے طویل سفر، ریاضت اور تپسیا کے بعد حاصل ہوا۔ خیال کی پُرخار وادیوں میں بھٹکتے بھٹکتے میرے پاؤں میں آبلے پڑے، دامن جھاڑیوں میں اُلجھا، چہرہ اور ہاتھ بھی زخمی ہوئے لیکن میں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ اپنی تلاش اور کھوج میں نکلنا اور پھر مستقل مزاجی سے جنگلوں، صحراؤں، بستیوں، بیابانوں اور ویرانوں کی خاک چھاننا کوئی آسان کام نہیں لیکن منزل کی جستجو اور خود کو پالینے کی آرزو اور لگن سر پر ایسی سوار رہی کہ مسلسل بیس برس تک مَیں دن رات کی پروا کیے بغیر چلتا رہا اور آخر کار ایک روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ مَیں تو اپنے پاس ہی موجود ہوں۔''

اشرف نقوی اپنی کامیابی کا سہرا اللہ کی رحمت، کرم نوازی اور اپنے والدین کی دُعاؤں کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

مجھ پر کرم ہے خاص خدائے سُخن تِرا
مَیں مُعتبر ہوں آج ہُنر کے بغیر بھی
ماں باپ کی دُعاؤں کا اشرف یہ فیض ہے
چھاؤں ہے میرے سر پہ شجر کے بغیر بھی
(''زادِحرف'': صفحہ نمبر۱۲۶)

اپنی کوششوں اور جستجو کو وہ اِس طرح بیان کرتے ہیں:

ملی نہیں مجھے یونہی مراد کی منزل
مَیں خود غبار ہوا ، کارواں بناتے ہوئے

اشرف نقوی چونکہ سادات گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کے کلام میں کربلا کا استعارہ بہت زیادہ ہے۔ کربلا کا واقعہ بھی تاریخ کا ایک ایسا ہی باب ہے جو کئی سو سال گزر جانے پر بھی تازہ ہے۔ یہ واقعہ اصول پسندی ، راست گوئی، صبر، استقامت ،مزاحمت ،حُریت اور قربانی کا استعار ہے۔حق و باطل میں تمیز اور زندگی کی سچائیوں اور دینی احکامات پر عمل اشرف نقوی کی شاعری کا خاصہ ہے۔

بخشا وقار جس کو محمدؐ کی آل نے
وہ کربلا تو اب بھی نگر روشنی کا ہے

اشرف نقوی الیکٹرونک اور سوشل میڈیا پر بھی اپنی تحریریں اور شاعری شائع کرتے رہتے ہیں۔ان کی بہت سی نظمیں اور غزلیں ہمیں مختلف ویب سائٹس پر نظر آتی ہیں جن میں سے ایک ''اُردو پوائنٹ'' ہے۔وہاں بے شمار غزلیں ہمیں موجود ملتی ہیں۔

مر کر مجھے جینے کا ہُنر آتا ہے اشرف
مر کر بھی مَیں زندہ مہ و اختر میں رہوں گا

الیکٹرونک میڈیا کے اِس دور میں، جس میں کتاب دم توڑ رہی ہے، ضروری ہے کہ کتاب کا احیاء کیا جائے۔ گو عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ ہم ''ترک واختیار'' کے معاملے میں شدت پسند واقع ہوئے ہیں۔ جس چیز سے مُنہ موڑ لیا، پھر نہ وہ ریت باقی رہتی ہے اور نہ رسم جاری رہتی ہے۔ خواہ وہ مستقبل میں جس قدر بھی فائدہ مند ہو سکتی ہو۔ کتابی مطالعہ بھی اِسی بے اعتنائی کا شکار ہے۔ لوگ ضروریاتِ زندگی اور سامانِ آسائش وآرائش پر دل کھول کر پرس کھولتے ہیں مگر کتابیں خریدنے میں بہت بخیل ہیں اور اُن کے مطالعے سے گریزاں بھی بہت ہیں۔ اِس کی ایک وجہ تو انٹرنیٹ کی وافر سہولتیں ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ شوقِ مطالعہ گہنا چکا ہے۔ یہاں تک کہ حلقۂ علم وادب میں بھی یہ شوق پژمردہ ہو کے رہ گیا ہے۔ وہ بھی اِس قدر کہ تحفے میں دی گئی کتب بھی اپنے کھوئے جانے اور مطالعے کی نگاہوں کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ دوسری طرف صاحبانِ علم وقلم کا تصنیفی شوق اشاعتی ذوق اپنے جوبن پر ہے۔ نتیجتاً کتابوں پر کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ رہی ہیں حالانکہ کاغذ وطباعت کی مہنگائی اور کتابوں کی فروخت سرِ راہے۔ اِس دگرگوں صورتِ حال میں ضروری ہے کہ کتاب بینی کے شوق کو اُجاگر کیا جائے۔

عربی کے نامور شاعر مبنی کے ایک شعر کا مصرع ہے ''وخیر جلیس فی الزمان الکتاب'' کہ زمانہ میں بہترین ہم نشیں کتاب ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اچھی کتاب اپنے قاری کے لیے ایسے دوست کی حیثیت رکھتی ہے جو اُس کو کبھی تنہائی کا احساس ہونے دیتی ہے نہ اکتاہٹ کو اُس کے قریب پھٹکنے دیتی ہے۔ یہ ایک ایسے ہم سفر کی مانند ہے جو اپنے ساتھی کو دُور دراز کے علاقوں اور شہروں کی سیر کرا دیتی ہے۔ اِسی سے انسان کو ایسی شخصیات سے مصاحبت کا شرف حاصل ہوتا ہے جن سے ملاقات کی خاطر طویل اسفار طے کیے جاتے ہوں یا جو راہیِ مُلکِ عدم ہو چکے ہوں۔ متعدد متنوع افکار ونظریات سے واقفیت اِس کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ کتابوں سے وابستگی کی نعمت کا کسی کو اِدراک ہو جائے تو اس کے لیے بغیر مطالعہ کے زندگی گزارنا دُشوار ہو جاتا ہے۔ یہی اس کے دن رات کا اوڑھنا بچھونا بن جاتی ہیں، اگر وہ بیمار بھی ہوتا ہے تو

کتاب ہی اُس کا علاج ہوتی ہے، رنج و بے چینی کی حالت میں کتاب ہی اُس کی غم خواری کا سامان فراہم کرتی ہے، مشکلات ومصائب میں بھی وہی تسلی کا باعث ہوتی ہے کیونکہ کتاب ہی تو اُس کے شب وروز کی دمساز وہمراز بن چکی ہوتی ہے۔

کتب بینی ایک نہایت مفید مشغلہ ہے۔ یہ علم میں اضافے اور پریشانیوں سے چھٹکارے کے لیے نہایت مؤثر نسخہ ہے۔صدیوں پہلے کے ایک عرب مصنف ''الجاحظ'' نے ایک پریشان حال شخص کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا: ''کتاب ایک ایسا دوست ہے جو آپ کی خوشامدانہ تعریف نہیں کرتا اور نہ آپ کو برائی کے راستے پر ڈالتا ہے۔ یہ دوست آپ کو اُکتاہٹ میں مبتلا ہونے نہیں دیتا۔ یہ ایک ایسا پڑوسی ہے جو آپ کو کبھی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ یہ ایک ایسا واقفِ کار ہے جو جھوٹ اور منافقت سے آپ سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کرے گا۔''

اشرف نقوی کہتے ہیں کہ ہم نے یہی کوشش کی ہے کہ میسّر کتابوں کے تجزیے اور محاکمے لکھیں اور رسائل وجرائد میں شائع کر کے لوگوں تک پہنچائیں تاکہ وہ ان سے متعارف ہوں اور انھیں پڑھنے کے لیے تیار رہیں۔ ہماری یہ کوشش بارور ہوتی ہے یا نہیں، البتہ ہمیں دِیا ضرور جلائے رکھنا چاہیے۔ اِس لیے کہ روشنی جس قدر بھی مدھم ہو، اندھیرے کا دامن ضرور تار تار ہوتا ہے اور اُجالا نمودار ہوتا ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

اگر شریق ہے کامل ، اندھیری رات میں بھی
ہوا منڈیر پر رکھ جائے گی دِیا کوئی

اشرف نقوی کے فی الحال دو شعری مجموعے منظرِ عام پر آئے ہیں اور آئندہ بھی ان شاء اللہ ان میں اضافہ ہوگا۔ان کی شاعری کسی کی نقالی نہیں کرتی بلکہ اِس میں نُدرتِ خیال کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ اپنے مجموعوں کو مکمل کرنے کے لیے اشرف نقوی نے بہت محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ اس لیے ان کے کام کو حلقۂ ادب میں بہت سراہا گیا ہے۔

یہ وقت کہیں پیچھے ہی رہ جائے نہ اشرف
اِس واسطے کچھ کم مِری رفتار ہوئی ہے
(''زادِحرف''صفحہ۵۶)

ہم اپنے چاک پہ صدیوں سے نامکمل تھے
یہ کارنامہ کسی دستِ بے ہُنر کا تھا
''آخرش''صفحہ۱۷۶

حوالہ جات

۱۔ سمیعہ نعیم، شیخوپورہ کی ادبی تنظیم ''دریچہ'' کی علمی و ادبی خدمات (مقالہ برائے ایم فِل، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد) سال ۲۰۱۷ء، صفحہ ۹

۲۔ بحوالہ انٹرویو، اشرف نقوی کا راقم الحروف کو دیا گیا، ۲۱ جولائی ۲۰۱۹ء، بمقام رہائش گاہ شیخوپورہ

۳۔ محمد نعیم خاں، ''شیخوپورہ کی ادبی روایت میں ارشد نعیم کا کردار'' (مقالہ ایم فل، منہاج یونیورسٹی، لاہور،) سال ۲۰۱۵ء، صفحہ ۲۱۲

۳۔ محمد نعیم خاں، ''شیخوپورہ کی ادبی روایت میں ارشد نعیم کا کردار'' (مقالہ ایم فل، منہاج یونیورسٹی، لاہور،) سال ۲۰۱۵ء، صفحہ ۲۱۳

۱۔ سمیعہ نعیم، شیخوپورہ کی ادبی تنظیم ''دریچہ'' کی علمی و ادبی خدمات (مقالہ برائے ایم فِل، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد) سال ۲۰۱۷ء، صفحہ ۱۰

باب نمبر ۲

''اشرف نقوی کی غزل کا فکری جائزہ''

1857ء کے بعد کا ہندوستان ایک نئی صورتِ حال سے دوچار ہوا۔ نئے طرزِ زندگی نے ذہن کو متأثر کرنا شروع کیا۔ سرسیّد، حالی، شبلی وغیرہ نے سماجی اصلاح کے دائرے کو وسعت دیتے ہوئے اس میں علم وادب کے معاملات کو بھی شامل کروایا۔ یہ لوگ اُردو زبان وادب کے ذریعے اس مشن کو آگے بڑھانا چاہتے تھے مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ علم وادب کے موضوعات کے ساتھ ساتھ اظہار واسلوب کا بھی ایک ایسا معیار قائم ہو جو سماجی تبدیلیوں کے مؤثر طریقے کی ترجمانی کر سکے۔

حالؔی نے جب اُردو شعروادب اور خصوصًا غزل کا محاسبہ کیا تو اُنھیں غزل میں گل وبلبل کی فرضی کہانیاں نظر آئیں۔ حالؔی کا اس بات پر پورا یقین تھا کہ جو نئی صورتِ حال پیدا ہوئی ہے اس میں غزل کے روایتی فرسودہ تصورات ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے۔ حالؔی کے اِسی مجتہدانہ اندازِ فکر کا نتیجہ ہے کہ اُنھوں نے نئی ضرورتوں اور نئے تقاضوں کے پیشِ نظر شعری اصناف کے مزاج اور میلان میں اصلاحات کے دلائل پیش کیے۔

وہ غزل کے حُسن اور اس کی قوت کے منکر نہیں تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ غزل میں بھی ان موضوعات کو پیش کرنا چاہیے جنھیں وقت کی گردشوں نے جنم دیا۔ حالؔی نے مقصدیت پر زور دیتے ہوئے خیال بندی، مبالغہ اور صنّاعی کی بجائے اصلیت، جوش اور سادگی کو زیادہ اہمیت دی۔ دَورِ حاضر کی غزل کی ایک خاص بات یہ ہے کہ آج غزل میں مشکل اور دقیق فارسی وعربی آمیز الفاظ وتراکیب کی جگہ روزمرّہ کی زبان نے لے لی ہے جس میں نئے الفاظ اور عام اشیاء سے سجے استعاروں اور علامتوں کو تراشنے کا رواج عام ہو چکا ہے۔ مقامی اور علاقائی زبانوں، عوامی ادب کی روایتوں اور مذہبی وتہذیبی قدروں کے اثر سے نئے الفاظ، محاورے، کہاوتیں اور اظہار کے پیرائے اپنائے جا رہے ہیں۔ حالانکہ اب دہلی اور لکھنؤ دبستان نہیں رہے جہاں پر غزل کی زبان کو صاف کیا جائے۔ اِس کے

باوجود غزل اپنی زبان میں بگاڑ پیدا نہیں کرسکی ہے۔ خوابوں کا ٹوٹنا، گھر سے بے گھر ہونا، پُرہجوم شہروں کا اُجاڑپن، ہر طرف اڈتی ہوئی بھیڑ میں انسان کی اجنبیت اور تنہائی اور اِسی طرح کی کیفیات کا اظہار ہونے لگا ہے۔ اِس طرح آج کی زبان زندگی کی سچائیوں سے عبارت ہے۔

آج کی غزل نے پرانی دیومالائی تہذیب، رسمِ عاشقی کی داستان، گل وبلبل کی حکایات، ساغر و جام اور مے کدہ کی روایات کو ایک طرف رکھ دیا ہے اور دورِ حاضر کے تہذیبی اور سماجی تجربہ کو بنیاد بنا کر اپنے منفرد شعری اظہار کو دریافت کرنے کی کوشش میں ہے۔ اِس کی خوب صورتی یہ ہے کہ نئے طرزِ احساس کے پس منظر میں غزل کی روایتی پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں، کلاسیکی منظر بھی دیکھے جا سکتے ہیں، غزل کا جغرافیہ بھی نظر آتا ہے، غزل کی جمالیات کا عکس بھی جھلکتا ہے اور غزل کی مخصوص تہذیبی وروایتی شناخت اور شائستگی بھی اپنے آثار کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی ہے۔

ادب کی صورت گری میں جہاں انسانی احساس و اِدراک اور ذہن وفکر کام کرتے ہیں وہاں وقت اور حالات کا بھی ایک کردار ہوتا ہے۔ اِن دونوں کی کشاکش کا تجزیہ فوری اور ہنگامی طور پر نہیں کیا جا سکتا لیکن ایک قابلِ لحاظ فاصلہ طے ہوجانے کے بعد جونقوشِ قدم اُبھرتے ہیں اُنھیں دیکھ کر کچھ نتائج برآمد کیے جا سکتے ہیں اور اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وقت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھ کر کتنا اور کیسا ادب تخلیق ہوا؟ یا حالات کا رُخ موڑنے میں ادب نے کیا کردار ادا کیا؟ تاریخ کے اہم موڑوں پر ایک ایک دو دو شاعر وادیب کھڑے نظر آتے ہیں، باقی سب ان کے پیروکار معلوم ہوتے ہیں یا پھر وقت کے ریلے میں بہہ جانے والا ایک انبوہ ہوتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی کی شخصیت کئی لحاظ سے مطالعہ کے قابل ہے۔ آزاد اور شبلی کی طرح وہ بیک وقت شاعر، ادیب، سوانح نگار اور نقاد ہیں۔ وہ ایک منفرد شاعر، صاحبِ طرز ادیب، باذوق سوانح نگار اور وسیع النظر نقاد کی حیثیت سے اُردو اَدب میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔ حالی کا تعلق سرسیّد کی تحریک اور سرسیّد کی شخصیت سے بہت زیادہ تھا۔ اور سرسیّد کے زیرِ اثر ہی حالی نے 'مسدّسِ حالی' تصنیف کی۔ سرسیّد کی رفاقت

،مولانا محمد حسین آزاد کی دوستی اور محکمہ تعلیم کی ملازمت کے دوران انگریزی سے اُردو میں ترجمہ ہونے والی کتابوں کے مطالعے نے حالی کو اُردو شاعری میں نئے رُجحانات سے آشنا کیا۔ چنانچہ اُنھوں نے پرانی طرزِ شاعری کو ترک کر کے نئے اسلوبِ شعر کی طرف توجہ کی اور اُردو میں جدید شاعری کے اُستاد کہلائے۔خود نئے انداز میں شعر کہنے شروع کیے اور دوسروں کو نئے شعر کی طرف راغب کیا۔اُن کے تنقیدی نظریات مختلف کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں لیکن 'مقدمہ شعروشاعری' اُن کی تنقید کی باقاعدہ کتاب ہے۔اُنھوں نے مغربی تنقید کے اصولوں کو مشرق میں رواج دینے کی کوشش کی۔اِس کے علاوہ مختلف اصنافِ سُخن پر بھی بحث کی۔

'مقدمہ شعروشاعری' کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں شعر کی تعریف، اُس کی تاثیر وافادیت اور الفاظ و معانی کی اہمیت کی تشریح کی گئی ہے۔اِس کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری کے بنیادی اصول مرتب کر کے اس کے لیے ضروری شرائط پیش کی گئی ہیں جن کی بحث و ترتیب میں عربی معیارِ تنقید کے علاوہ مغربی تنقید کے خیالات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

حالؔی نے خود اپنی غزلوں میں ملکی اور قومی مسائل پیش کر کے غزل کو ایک نیا منظر نامہ فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔حالؔی کی کوششوں سے اِتنا ضرور ہوا کہ غزل کی پرانی لفظیات و استعارے کو نئے تناظر میں استعمال کرنے کا رُجحان سامنے آیا۔حالؔی کی اپنی تربیت جس کلاسیکی ماحول میں ہوئی تھی اُس کے کچھ تقاضے بھی تھے۔یہی وجہ ہے کہ کلاسیکیت اور روایت سے انحراف کی شعوری کوشش کے باوجود حالؔی کی جدید غزلوں میں غزل کا روایتی انداز موجود ہے۔

رنجشیں ، التفات و راز و نیاز
ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز

☆......☆......☆

تکلّف علامت ہے بے گانگی کی
نہ ڈالو تکلّف کی عادت زیادہ

☆......☆......☆

قدرِ نعمت ہے بقدرِ انتظار
حشر پر ٹھہری ہے مہمانی مِری

☆......☆......☆

ہے وہ دہر آشنا تو عیب ہے کیا
مرتے ہیں ہم ان ہی اداؤں پر

☆......☆......☆

شِکوہ کرنے کی خُو نہ تھی اپنی
پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج
اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
اُس نے اچھا ہی کیا ، حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اُٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

☆......☆......☆

عشق سُنتے ہیں جسے ہم ، وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اِک شخص سمایا جاتا

یہ اشعار حالؔی کے اُس مزاج کی غمازی کرتے ہیں جس سے غزل کا ایک جمالیاتی تصور قائم ہے۔ ان میں معنی کی وسعت تو نہیں مگر ایک جذب و کیف اور گفتگو کا دلکش انداز ضرور پایا جاتا ہے۔

اُس دَور کے اہم شاعر اکبر الٰہ آبادی بھی ہیں جو مغرب کی پیروی کو مسلمانوں کے لیے ضرر رساں تصور کرتے ہیں۔ قوم کی اصلاح اور ترقی کے سلسلے میں اکبر کا نظریہ سر سیّد اور حالی وغیرہ سے مختلف تھا۔ اکبر کی غزل پڑھ کر چاہے

ہم جو بھی تاثر قائم کریں لیکن اِس حقیقت کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ غزل پہلی مرتبہ اِتنے بڑے پیمانے پر موضوع اور ڈکشن کی سطحوں پر تبدیلیوں سے گزری۔ اکبر کے ہاں غزل کا وہ رنگ بھی موجود ہے جو عام طور پر غزل کا بنیادی رنگ سمجھا جاتا ہے لیکن اکبر کا مسئلہ کسی صاحبِ ذوق کی تسکین کا انتظام کرنا نہیں تھا۔ وہ اسی طرح غزل کہتے جا رہے تھے جو وقت کا تقاضا تھا۔ نازک بیانیاں اور معنی کی بھول بھلیّاں اکبر کے اندازِ فکر اور مشن کے لیے مناسب نہیں تھیں۔ اکبر کہتے ہیں:

معنی کو چھوڑ کر جو ہوں نازک بیانیاں
وہ شعر کیا ہے ، رنگ ہے لفظوں کے خون کا

اکبر الٰہ آبادی نے مغربی تہذیب، مسلمانوں کی مغربی تہذیب سے قربت، معاشرے کے غلط رسم و رواج، اپنے عہد کی سیاست اور اُس دَور میں چلنے والی تحریکوں اور رجحانوں کے خلاف اپنی طنز و مزاح سے بھرپور ''ردِّعمل'' کی شاعری کے ذریعے شُہرت حاصل کی اور ادب کی تاریخ میں ''لسان العصر'' کا لقب حاصل کیا۔ اکبر الٰہ آبادی کی اپنے عہد اور مغربی تہذیب کی مخالفت کی وجوہات جاننے کے لیے ہمیں ان کے حالاتِ زندگی اور اُس دَور کے ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات سے واقف ہونا ضروری ہے۔

اکبر الٰہ آبادی کے دَور میں ہندوستان میں سیاسی، معاشرتی اور ادبی نقطۂ نظر سے انقلابی تبدیلیاں رُونما ہوئیں۔ وہ جب گیارہ سال کے تھے تب 1857ء کی ہندوستانیوں کی پہلی جنگِ آزادی لڑی گئی۔ انگریز اسے غدر کہتے ہیں۔ غدر میں ناکامی کے بعد ہندوستان سے عظیم تر مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ وسیع و عریض ملک پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا اور ہندوستانی عوام انگریزوں کے غلام ہو گئے۔ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہو گیا۔ اقتدار میں آتے ہی انگریزوں نے مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھانے شروع کیے۔ وہ ہر طرح سے مسلمانوں کو کمزور کر دینا چاہتے تھے۔ انگریزوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو کُچل کر ہی اپنے قدم مضبوطی سے جمائے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ

ایک طرف مسلمانوں کے قتل وخون کا بازار گرم کیا گیا تو دوسری طرف مسلمانوں کے تعلیمی نظام کو برباد کیا گیا۔مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے برطرف کردیا گیا۔اُن کی جاگیریں، منصب اور وظیفے ختم کردیے گئے۔متعدد افراد کو کالے پانی کی سزا سُنائی گئی ۔ بے شمار لوگوں کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ لاکھوں گھر اُجڑ گئے۔کل تک جو لوگ حکومت میں بڑے بڑے عُہدوں پر فائز تھے،شہزادے اور ولی عہد تھے، وہ معزول ہوکر بھیک مانگتے دیکھے گئے۔میرؔ نے مغل شہزادوں کے زوال کا منظر یوں بیان کیا تھا:

دِلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُنھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

اکبرالٰہ آبادی اُردو میں طنز و مزاح کے نمائندہ شاعر ہیں۔''کلیاتِ اکبر'' پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے غزل، نظم ، رُباعی ، قطعات اور کئی متفرق اشعار پر مبنی اپنی طنز و مزاح اور سنجیدگی سے پُر شاعری کو پیش کیا ہے۔اکبر الٰہ آبادی ایک فطری شاعر تھے۔بچپن سے شعر کہنے لگے تھے۔اُس زمانے کے مشہور شاعر غلام وحید سے اصلاح لیتے تھے۔اُنھوں نے اپنی شاعری کی اِبتداء روایتی طرز کی غزل گوئی سے کی۔اُن کے ابتدائی کلام میں رنگینی، شوخی اور روایتی لب و لہجہ میں ہجر و وصال کا بیان ہے۔زبان کا چٹخارہ، روایتِ لفظی کا اہتمام اور دُور از کار تشبیہات کا استعمال اُن کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔اودھ پنچ کی طنز و مزاح کی تحریک کے آغاز کے ساتھ اکبرالٰہ آبادی مزاحیہ شاعری کرنے لگے۔ابتداء میں اُن کے ہاں ابتذال بھی تھا۔اکبرالٰہ آبادی کہتے ہیں:

بہت ہی بگڑے وہ کل مجھ سے پہلے بوسے پر
خوش ہو گئے آخر کو تین چار کے بعد
حقیقی اور مجازی شاعری میں فرق ہے اِتنا
کہ یہ جامے سے باہر ہے وہ پاجامے سے باہر ہے

اکبر الٰہ آبادی نئی تعلیم کے باب میں اِس وجہ سے شک وشبہ میں مبتلا تھے کہ اُنھیں خدشہ تھا کہ کہیں اِس سے مسلمانوں پر مغربی خیالات ، مغربی تہذیب اور مغرب کی لادین سوسائٹی کا رنگ نہ غالب آجائے ۔ سر سیّد سے اُن کا بنیادی اختلاف اِسی وجہ سے تھا۔ کالج کا نام لے کر اُنھوں نے اپنے طنز کو یوں پیش کیا ہے:

ابتداء کی جنابِ سیّد نے
جن کے کالج کا نام اِتنا ہوا
انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی
قوم کا کام اب تمام ہوا

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گِرا کے چُپکے چُپکے بجلیاں دینی عقائد پر

کالج کی تعلیم کے مُضِر اثرات کو اُجاگر کرتا اکبر الٰہ آبادی کا یہ شعر کافی مشہور ہوا:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سُوجھی

اکبر الٰہ آبادی پر اکثر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ انگریزی تعلیم کے خلاف تھے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ۔ اُنھوں نے خود جُستجو کے ساتھ انگریزی پڑھی تھی اور بعد میں اپنے صاحب زادے عشرت حسین کو بھی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے برطانیہ بھیجا تھا۔ اپنی ایک نظم میں وہ ایک ذمہ دار باپ کا فرض نبھاتے ہوئے عشرت حسین کو یوں نصیحت کرتے ہیں:

مغرب کے مُرشدوں سے تُو پڑھ چکا بہت کچھ
پیرانِ مشرق سے اب فیض کی نظر لے

اُن کے دَور میں لڑکیوں کی تعلیم کے نام پر بے پردگی ، مردوں کی مجلسوں میں عورتوں کی شرکت ،

مغربی لباس، مغربی طرز کی دعوتیں، کلب، ناچ گھر وغیرہ میں مسلمان گھرنے لگے تھے۔ اکبر الٰہ آبادی نے لڑکیوں کی بے پردگی پر چوٹ کرتے ہوئے اپنا یہ مشہور قطعہ کہا:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے ، آپ کا پردہ ، وہ کیا ہوا؟
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

سرسیّد اور حالی کی طرح اکبر اِلٰہ آبادی بھی اصلاح پسند کے طور پر نظر آتے ہیں۔ اِس پہلو کو اُجاگر کرتے ہوئے صدیق الرحمن قدوائی لکھتے ہیں:

''اکبر اِلٰہ آبادی کے نزدیک شاعری کا مقصد زندگی کی تنقید و اصلاح تھا۔ سر سیّد تحریک کے علمبرداروں نے اور اکبر الٰہ آبادی نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق شاعری کے ذریعے قومی اصلاح کی کوشش کی۔ سماجی اعتبار سے متضاد نقطہ نظر رکھنے کے باوجود سر سیّد، حالی اور اکبر یکساں ادبی نقطۂ نظر کے حامل تھے۔''

(صدیق الرحمن قدوائی۔ انتخاب اکبر اِلٰہ آبادی۔ دہلی، ۱۹۹۴ء)

اکبر الٰہ آبادی کی شاعری بیانیہ شاعری ہے۔ اُن کی شاعری سے انسانوں کو وطن دوستی، مشرقی تہذیب سے محبت کا سلیقہ اور اعلیٰ انسانی اقدار کی پاسداری کا سبق ملتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اکبر الٰہ آبادی کی شاعری سے ملنے والی فکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اکبر اِلٰہ آبادی کی شاعری اور اُن کا تہذیبی زاویہ نظر ہمیں آج بھی دعوتِ فکر دیتا ہے۔ اُن کی آواز وہ آواز ہے جو نہ صرف پاکستان و ہندوستان کو بلکہ سارے ایشیا کو زندہ رہنے اور خود کو از سرِ نو دریافت کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی جیسا شاعر ایشیا کی کسی بھی دُوسری زبان میں مجھے نظر نہیں آتا جس نے مغربی تہذیب کے غلبے سے بچنے کے لیے جس دلچسپ اور

دلکش انداز میں اپنی جڑوں سے پیوستہ رہنے کی تلقین کی ہو اور قوموں کی تخلیقی صلاحیتوں کو زندہ باقی رکھنے کا گُر سکھایا ہو۔ اِس لیے مَیں اکبر الٰہ آبادی کو صرف مزاحیہ شاعر نہیں بلکہ جدید فلسفی شاعر سمجھتا ہوں۔''

(ڈاکٹر جمیل جالبی۔ معاصر ادب۔ صفحہ ۱۶۴، دہلی، ۱۹۹۶ء)

اُس دور کے ایک شاعر حلبت بھی ہیں جو بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن اُنھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں جن کی تعداد کم و بیش پچاس ہے۔ اُن کی شاعری جذبات و احساسات کی شاعری ہے۔

نئی غزل کے پس منظر میں شاد عظیم آبادی کا نام بہت اہم ہے۔ شاد سے قبل غالب کا نام غزل کے تعلق سے سب سے بڑا ہے۔ غالب کے بعد کا زمانہ غزل کے لیے آزمائشوں کا تھا۔ اب مقصدی اور افادی ادب پر زور دیے جانے کی وجہ سے موضوعاتی نظموں کا چلن عام ہوا۔ غالب کے بعد اقبال نے اپنی غزلوں میں بعض نئی علامتوں اور الفاظ کے ذریعے فکر اور زبان کی سطح پر تازگی اور توانائی پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

اُردو کی ادبی برادری عقل و دانش سے کم اور جذبات سے زیادہ کام لینے کی عادی ہے۔ اِسی لیے بیسویں صدی کے اواخر میں قیاس آرائیاں کرتے ہوئے یہ فیصلہ سُنایا گیا کہ آنے والا عہد شاعری کا نہیں بلکہ فِکشن یا افسانوی ادب کا ہوگا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسی باتیں سوائے اُردو والوں کے کسی اور زبان والوں نے نہیں کیں۔ اُن کا خیال تھا کہ جدیدیت اور ابہام سے الگ شاعری نہیں کی جا سکتی۔ اِس بیان کا اثر تھا یا ذاتی دلچسپی، بہت سے فنکار ناول نگاری میں دلچسپی لینے لگے اور اُنگلی کٹا کر شہیدوں میں شمار ہونے کی خاطر اِس میدان میں کود پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ناولوں کے انبار لگا دیے۔ مگر شعراء غزل کے گیسو سنوارنے میں کسی بھی معاملے میں پیچھے نہیں رہے۔ حالانکہ غزل کا کینوس اس ناول یا فکشن کی طرح وسیع نہیں ہوتا بلکہ تنگ اور محدود ہوتا ہے یہاں صرف دو مصرعوں میں خیال یا جذبہ کو مکمل کرنا پڑتا ہے۔

غالب اور اقبال کے درمیان جو زمانی فاصلہ ہے اُس پر نگاہ ڈالی جائے تو غزل کے حوالے سے سب سے اہم نام شادؔ عظیم آبادی کا آتا ہے۔ شادؔ نے حیات و کائنات کے چند بنیادی موضوعات و مسائل پر غور و فکر سے کام لے کر اپنی ذہانت سے اِس میں ایسی جہت کا اضافہ کیا ہے جو اس عہد میں شادؔ ہی کا امتیاز ہے۔

شادؔ عظیم آبادی کا شمار اُردو کے کلاسیکی شعراء میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے نثر اور نظم میں پچاسوں کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، جن سے اُن کی گوناگوں خوبیوں کا علم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاد اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ اُنھوں نے اُردو شاعری کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اُن کی شخصیت کا اصل جوہر غزلوں ہی میں کھلتا ہے۔ شاد عظیم آبادی کا شعری لہجہ منفرد بھی ہے اور مؤثر بھی ۔ اُن کی شاعری ایک طرف دبستانِ لکھنؤ سے کسبِ فیض کرتی ہے تو دوسری طرف دبستانِ دہلی کی شعری خصوصیات بھی اپناتی ہے۔ وہ اگر قدیم شعری لہجے کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں تو اپنے دَور کے جدید طرزِ اظہار سے بھی پوری طرح آشنا ہیں۔

شادؔ عظیم آبادی کا اصل نام علی محمد، تخلّص شاد تھا۔ اُن کی ولادت ۸ جنوری، ۱۸۶۴ء کو نانا کے مکان واقع پورب دروازہ، شہر عظیم آباد (پٹنہ) میں ہوئی تھی۔ اُنھیں اپنے شہر سے بے حد لگاؤ تھا ،جس کا ثبوت یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے نام کے ساتھ اپنے شہر کا نام بھی منسلک کرلیا۔ آپ کے والد کا نام سیّد اظہار حسین عرف عباس مرزا تھا، جو اِلٰہ آباد کے رہنے والے تھے۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں وہ عظیم آباد چلے آئے جہاں شادؔ پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم کا سلسلہ چار برس کی عمر سے شروع ہو گیا تھا۔ اُن کے اساتذہ میں سیّد فرحت حسین ،سیّد رمضان علی، شیخ برکت اللہ، شیخ آغا جان اور حاجی محمد رضا جیسے نامور لوگوں کا نام شامل ہے۔ حالانکہ شاد عظیم آبادی نے اپنے اُستاد کا نام سیّد شاہ اُلفت حسین فریاد تحریر کیا ہے۔

شادؔ عظیم آبادی نے نثر و نظم میں کل ملا کر تقریباً ساٹھ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے

زیادہ تر زیورِطبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔کُلیاتِ شاد تین حِصّوں میں اُردو کے نامور نقاد کلیم الدین احمد نے ترتیب دے کر ۱۹۷۸ء میں شائع کیا۔شاد عظیم آبادی نے شعری میدان کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی تقریباً ۴۲ کتابیں تصنیف کی ہیں،جن میں سے بعض ابھی طباعت کی منتظر ہیں۔

شاد عظیم آبادی نے جیسا کہ پچھلے صفحات میں عرض کیا گیا،مثنوی،غزل،قصیدہ،مرثیہ اور دوسری اصنافِ سُخن میں بھی طبع آزمائی کی لیکن اُن کی شہرت کا اصل سبب اُن کی غزلیں ہیں،جو سادگی، گھلاوٹ،ترنم وشیریں بیانی،کیف وسرور اور تاثیر اور اثر کی بدولت لائقِ توجہ ہیں۔اُن کے کلام کی سب سے ممتاز خوبی اُن کی زبان کی صفائی اور سادگی ہے۔وہ نہایت شیریں اور منتخب الفاظ استعمال کرتے ہیں جو فوراً دل ودماغ کو متأثر کرتے ہیں۔

شاد کے زمانے میں غزل کا زور ذرا کم ہونے لگا تھا۔اُس وقت اُنھوں نے بھی اپنے چند ہم عصروں کے ساتھ غزل کی پلکیں سنوارنے میں خاص کردار ادا کیا اور اپنے منفرد لب ولہجے میں اسے ایک توانائی بھی عطا کی۔وارداتِ قلبی کے ساتھ ہی ساتھ اخلاق،فلسفہ اور توحید اُن کے محبوب موضوعات ہیں۔اُنھوں نے اپنی غزلوں میں حمد،نعت اور منقبت کے مضامین کو اِس طرح سے پرو دیا کہ ان سے ان کی غزلوں کو ایک نئی معنویت حاصل ہو گئی۔

شاد عظیم آبادی کے بعض اشعار کی تفہیم کا حق اُس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُن کے مذہبی تناظر اور اُن احادیث سے واقفیت نہ ہو جن سے شعر میں استفادہ کیا گیا۔اُن کے بہت سے شعر اِسی خصوصیت کے حامل ہیں۔اُنھیں اسلامی پس منظر میں پیش کرتے ہوئے غزل کی علامتوں سے مذہبی تصورات کی آئینہ داری کا کام لیا گیا۔اُن کی شاعری اگر ایک طرف خُمریاتی شاعری کے موضوعات اور غزل کی علامتوں کی لچک داری اور نئے مفہوم کی ترجمانی سے کام لیا گیا تو دوسری طرف اُن کا سلسلہ صنفِ مرثیہ کے ''ساقی نامہ'' سے اُستوار نظر آتا ہے۔''ساقی نامہ'' کا بنیادی تصور آنحضرت ﷺ اور خانوادۂ رسالت کی محبت کو شرابِ طہور کے تصور سے ہم آہنگ کرنا ہے۔اِس

شرابِ پاکیزہ کی تعریف دیکھیے:

یدِ قدرت سے بنی عرش کے مَے خانے میں
جو چھلکتی رہی قرآن کے پیمانے میں
نوحؑ و اصحاب بہم جس کے سہارے پہنچے
جس کا ڈوبا ہوا کوثر کے کنارے پہنچے

ایک اور بند ملاحظہ ہو:

شعلۂ نار و سقر سے جو بچا لے وہ شراب
حشر میں گرتے ہوؤں کو جو سنبھالے وہ شراب
آگ کی طرح گناہوں کو جو کھا لے وہ شراب
اپنی پاکی پہ جو قرآن اُٹھا لے وہ شراب
جس کی قوت سے جوانی فلکِ پیر میں ہے
جس کی منزل قدحِ آئینِ تطہیر میں ہے

جدید غزل نگار کے نزدیک جذبے کی اہمیت ہے۔ وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کسی شعری اسلوب اور پُرتکلف انداز میں کرتا بلکہ جدید شعراء کی عمیق فکر تہذیب سے گہرے تعلق اور ماحول کے مطالعے سے نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ جدید غزل کا ایک طرف کلاسیکیت سے اس کا رشتہ محکم ہے تو دوسری طرف ساخت اور باخت سے نئے پن اور نُدرت کا احساس ہوتا ہے۔ جدید شعراء کے ہاں ماضی کے وِرثے کے طور پر میر کے لہجے کی غم ناکی اور دردمندی ہے تو غالب کا مفکرانہ اسلوب موجِ تہہ نشیں کی صورت میں ملتا ہے۔ یہ تقلیدِ میر و غالب سہی مگر اِس بات کا ثبوت بھی ہے کہ جدید غزل اپنے شاندار اور قابلِ فخر ماضی سے اٹوٹ اور گہرا رشتہ رکھتی ہے۔

اُردو غزل کو آبروئے شعرِ اُردو قرار دیا جاتا ہے۔ صدیوں کے عبور و مرور کے باوجود یہ

صنف آج بھی موجبِ دلکشی ہے۔اس صنف پر اعتراضات بھی ہوئے لیکن اُردو غزل کا جادو آج بھی قائم ہے۔تجرباتِ انسانی کی دُنیا چونکہ محدود نہیں، اِس لیے غزل کی قوتِ اظہار بھی کسی حد کو گوارا نہیں کرتی۔انسان کے متنوع خیالات کی رنگارنگی سے صنفِ غزل رنگین ہوگئی ہے۔

غزل میں سوز و گداز کی دُنیا بھی آباد ہوئی ہے اور محبوب کے حُسن و جمال کی محفل بھی سجائی گئی ہے لیکن ہر دور میں غزل نے اپنی انفرادیت قائم رکھی ہے۔غزل آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔غزل کی داخلیت اہلِ احساس کو متأثر کرتی ہے۔اِس کا دائرہ چونکہ زندگی اور زمانے کو محیط ہے اِس لیے اس کے اختصار میں ایک جہانِ معنی آباد ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جدید اُردو غزل کا آغاز ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد ہوا۔مولانا الطاف حسین حالی اور محمد حسین آزاد نے جدید اُردو غزل کی بنیاد ڈالی۔اِس روایت کو بعد کے زمانے میں علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی نے آگے بڑھایا اور نئی روِش پیدا کی۔اِسی طرح علی گڑھ تحریک اور ترقی پسند تحریک نے ادب، سماج اور سیاست کی تاریخ میں جو فعال کردار ادا کیا، اُس کی اہمیت سے کسی کو انکار ممکن نہیں۔

جوش نے آسان گوئی کی بجائے فنی اور علمی انداز پر زیادہ زور دیا اور تفکر کی ایک بلند تر سطح برقرار رکھی اور عوام کی نسبت خواص یعنی پڑھے لکھے طبقے میں زیادہ مقبول و محترم ٹھہرے۔آزادیٔ ہند کی لڑائی میں صرف ایسے مجاہدین کا کردار نہیں ہے جنھوں نے پروانہ وار میدانِ جنگ میں اُتر کر زورِ بازو کا مظاہرہ کیا بلکہ اس میں قلم کے سپاہی بھی اُن کے شانہ بہ شانہ کھڑے رہے اور شمع انقلاب کو اُس وقت تک جلائے رکھا جب تک کہ آزادی حاصل نہیں ہوگئی۔قلم کے ان سپاہیوں میں ایک اہم نام جوش ملیح آبادی کا بھی ہے جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ایک ایسا انقلاب برپا کیا کہ اُنھیں 'شاعرِ انقلاب' کا لقب حاصل ہوگیا۔5۔دسمبر، 1898ء کو ملیح آباد کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں آنکھیں کھولنے والے جوش ملیح آبادی کے باغیانہ تیور اور ملک کی آزادی کے تئیں اُن کے جذبہ سے سرشار اشعار کو آج بھی جب نوجوان پڑھتے ہیں تو اُن کے خون میں ایک اُبال سا پیدا ہوجاتا ہے۔

چند مثالیں دیکھیں:

اُٹھو ، چونکو ، منہ ہات دھو ، آنکھوں کو مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستاں والو!
کام ہے میرا تغیر ، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ ، انقلاب و انقلاب و انقلاب

اِن اشعار میں جوش ملیح آبادی کے ذریعہ کیے گئے لفظوں کے استعمال اوراس کے دروبست سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ پایہ کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دل میں آزادی کی تیز لہر رکھتے تھے۔ حالانکہ آزادی پر مبنی اُن کی کئی نظموں میں مشکل الفاظ کا استعمال بھی ہوا ہے جو عام فہم نہیں ہے لیکن اِس سے اُن کے شعری وقار میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ غالباً جوش کے ایسے ہی کلام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُردو اَدب میں نمایاں مقام رکھنے والے ظفر اقبال نے لکھا ہے:

''جہاں تک انقلابی شاعری کا تعلق ہے تو فیض اور حبیب جالب جوش سے زیادہ نمایاں رہے، کیوں کہ فیض اور بالخصوص جالب نے جس عوامی سطح پر اُتر کر شاعری کی، جوش نے آساں گوئی کی بجائے فنی اور علمی انداز پر زیادہ زور دیا اور تفکر کی ایک بلند تر سطح برقرار رکھی اور عوام کی نسبت خواص یعنی پڑھے لکھے طبقے میں زیادہ مقبول و محترم ٹھہرے۔''

یہ ٹھیک ہے کہ فیض احمد فیض اور حبیب جالب لوگوں میں جوش سے زیادہ مقبول ہیں لیکن اِس کی یہ وجہ قطعی نہیں ہے کہ اُن کا کلام مشکل ہے۔ دراصل جوش ملیح آبادی فراموشی کا شکار بھی ہوئے ہیں اور اِس کا اعتراف کئی ادیب کر چکے ہیں۔ محض 10 سال کی عمر میں شعر کہنے اور عزیز لکھنوی سے اصلاح لینے والے جوش کی شاعری میں الفاظ گُل اور بُوٹے کی مانند پروئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور جن اشعار میں جذبۂ آزادی موجود ہوتا ہے، وہاں تو لفظوں سے ایک شعلہ پھوٹ پڑتا ہے۔ 1918ء میں لکھی گئی اُن کی نظم 'وطن' کا پہلا بند دیکھیں جس میں لفظوں کے گل بوٹے صاف نظر آتے ہیں:

اے وطن! پاک وطن! روحِ روانِ احرار
اے کہ ذرّوں میں ترے بُوئے چمن ، رنگِ بہار
اے کہ خوابیدہ تِری خاک میں شاہانہ وقار
اے کہ ہر خار تِرا رُو کشِ صد رُوئے نگار
ریزے الماس کے ، تیرے خس و خاشاک میں ہیں
ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تِری خاک میں ہیں

اشرف نقوی کا تعلق بھی نئے شعراء میں سے ہے جنھوں نے جدید غزل میں ایک نام بنایا ہے۔ اپنے کام اور محنت سے وہ مختصر سے عرصے میں حلقۂ ادب میں ایک مقام حاصل کر چکے ہیں۔ اُن کے دو مجموعوں پر مشتمل ادب میں اُن کا کام حلقۂ ذوق میں شہرت حاصل کر چکا ہے۔ نئی غزل فکر اور اظہار کے اعتبار سے کلاسیکی غزل سے مختلف ہے۔ اِس بدلی ہوئی صورتِ حال کی نشان دہی اور شناخت اُسی وقت ممکن ہے جب کلاسیکی غزل کے تمام رنگ ہمارے سامنے ہوں۔ کلاسیکی غزل کے بہت سے الفاظ نئی غزل میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

جدید شاعری کی ابتداء عموماً حالیؔ اور اُن کے عہد سے مانی جاتی ہے۔ حالی نے اپنے دیوان کے مقدمے میں غزل کے بارے میں جو اصول قائم کیے، اُن اصولوں کی روشنی میں خود اُنھوں نے غزل کہہ کر ثابت کرنے کی کوشش کی کہ لب و رُخسار کے علاوہ دوسرے سماجی مسائل بھی غزل کا حصہ بن سکتے ہیں۔

مولانا حالیؔ کی شاعری لذّت اور اثر سے بھری ہوئی ہے۔ اُن کی ابتدائی شاعری پر غالب اور شیفتہ کا اثر نمایاں طور پر دِکھائی دیتا ہے۔ یہ اُن کی شاعری کا پہلا دور تھا۔ اُن کی شاعری کا دوسرا دور اُس وقت شروع ہوا جب اُن کی ملاقات سرسیّد سے ہوئی اور وہ اُن کی تحریک سے رضا کارانہ طور پر وابستہ ہو گئے۔ اسی مقام پر اُنھوں نے غزل کے نادیدہ محبوب کو چھوڑ کر پوری قوم کو اپنا محبوب بنا لیا اور

اُنھیں مسلمانوں کی بدحالی نے شدت سے گھیر لیا۔

اب سُنو حالی کے نوحے عمر بھر
ہو چکا ہنگامۂ مدحِ غزل

1857ء کی ناکام جنگِ آزادی میں جب دہلی کو فلک نے لوٹ کر ویران کر دیا تو اِس اُجڑے دیار کے رہنے والے شاعروں نے لکھنؤ اور لاہور کا رُخ کیا۔ حالی لاہور آئے اور یہاں آ کر محمد حسین آزاد اور پیارے لال آشوب کے ساتھ مل کر کرنل ہال رائیڈ کے کہنے پر جدید شاعری کا مشاعرہ برپا کیا۔ اِس تحریک کو بعد میں انجمن پنجاب کا نام دیا گیا۔ انجمن پنجاب کے تحت شاعروں نے گل وبلبل کے روایتی قصے اور ہجر ووصال کی داستانیں چھوڑ کر مناظرِ فطرت اور مُلک وقوم کے مجموعی دُکھ درد پر مسلسل نظمیں لکھیں۔ مولانا حالؔی نے شاعری کی زبان کو اِتنا سادہ بنا دیا کہ وہ تقریباً نثر سے مل گئی۔ مولانا حالؔی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے شاعری کو مشرف بہ اِسلام کیا اور اُردو اَدب میں اسلامی یا دینی شاعری کی بنیاد رکھی۔

حالؔی نے نظم گوئی قوم کی بیداری کے لیے شروع کی تھی کیونکہ اُنھیں اِس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ نثر کے مقابلے میں نظم کا اثر زیادہ ہے اور یہ کہ قوم کی تعمیر وترقی میں شاعری کا بنیادی حصہ ہے۔ مولانا حالؔی سے پہلے اگرچہ نظیر نے مختلف موضوعات پر نظمیں لکھی تھیں لیکن اُن کے سامنے کوئی واضح مقصد نہ تھا۔ لیکن مولانا حالؔی کی نظم نگاری کا خاص مقصد تباہ حال مسلمان قوم میں بیداری کی لہر دوڑانا تھا تاکہ مسلمان دوبارہ طاقت حاصل کر کے دُنیا کے حکمران بن جائیں۔ اُن کی شاعری اُردو ادب میں ایک تحریک اور رُجحان کی حیثیت رکھتی ہے۔ حالؔی نے قوم کو اپنے شاندار ماضی کی جھلکیاں دکھا کر بے دار کرنے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے قوم کا دُکھڑا کچھ اِس طرح رویا ہے:

ہماری ہر ایک بات میں سفلہ پن ہے
کمینوں سے بد تر ہمارا چلن ہے

لگا نامِ آباء کو ہم سے گہن ہے
ہمارا قدم ننگِ اہلِ وطن ہے
بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے

مولانا حالیؔ کے زمانے میں مغربی تعلیم کے اثر سے نئے نئے مسائل پیدا ہوئے۔ اُن کا دور اِنقلاب اور کشمکش کا دور تھا۔ اُنھوں نے اِن تمام مسائل کی اہمیت کو محسوس کیا اور اپنی شاعری میں انھیں بیان کرنا ضروری سمجھا۔ حالیؔ سے پہلے کسی شاعر میں اِتنی ہمت نہ ہوئی تھی کہ وہ نظم میں ایسے مسائل پر روشنی ڈالے جس سے دوسرے متأثر ہوسکیں۔ حالیؔ نے اِس کام کا بیڑہ اُٹھایا اور شاعری کی تمام اصناف کو اِس مقصد کے لیے استعمال کیا۔ حالی نظیر کی طرح سچائی، واقعہ نگاری اور حقیقت پسندی کے شاعر تھے لیکن اُن کی زبان نظیر کی طرح سُوقیانہ اور بازاری نہیں بلکہ پاکیزہ ہے۔ وہ کبھی گھٹیا اور معمولی درجے کا لفظ ستعمال نہیں کرتے۔ وہ راست گو تھے۔

ہم نہ کہتے تھے کہ حالیؔ چپ رہو
راست گوئی میں ہے رُسوائی بہت

نئی غزل کے سلسلے میں شمس الرحمن فاروقی کے دو مضامین ''نئی شاعری ایک امتحان'' اور '''ہندوستان میں نئی غزل'' اُن کی کتاب 'لفظ و معنی' میں شامل ہیں۔ ''نئی شاعری ایک امتحان'' کی ابتداء میں شمس الرحمن فاروقی نے اپنے مخصوص انداز میں پانچ سوالات قائم کئے ہیں۔ ''نئی شاعری'' سے آپ کیا مراد لیتے ہیں؟ ''نئی شاعری اور پرانی شاعری'' کے درمیان حدِ فاصل کیا ہے؟ اور ''کیا نئی شاعری ترقی پسند شاعری سے آگے اور مختلف ہے؟ اگر آپ کے خیال میں ایسا ہے تو کِن معنوں میں؟ ''اِس سوال کے جواب میں شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

''خالص میکانکی اور زمانی نظر سے نئی شاعری سے مَیں وہ شاعری مراد لیتا ہوں جو 1955ء کے بعد تخلیق ہوئی۔ 1955ء سے پہلے کے ادب کو مَیں نیا ادب نہیں سمجھتا۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ

1955ء کے بعد جو لکھا گیا وہ سب نئی شاعری کے زمرے میں آتا ہے۔ میری اِس تعیّنِ زمانی کی حیثیت صرف ایک Refrence کی ہے۔ داخلی اور معنوی حیثیت سے میں اِس شاعری کو جدید سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساسِ جرم، خوفِ تنہائی، کیفیتِ انتشار اور اس ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی نہج سے اظہار کرتی ہو۔''

شمس الرحمن فاروقی ایک نابغۂ روزگار شخصیت ہیں۔ اُنھیں اُن کے چالیس سے زائد اُردو، انگریزی تصانیف اور کارناموں پر ہندوستان کی کم و بیش سبھی اکیڈمیوں اور ادبی اداروں نے انعامات سے سرفراز کیا۔ علاوہ ازیں اُن کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ اِس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ برِصغیر کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ''سرسوتی سمان'' جو مالیت کے لحاظ سے بھی سب سے بڑا ہے، شمس الرحمن فاروقی کو ''شعرِ شور انگیز'' کے لیے ملا۔ فاروقی اُردو کے پہلے ادیب ہیں جنھیں ''سرسوتی سمان'' سے نوازا گیا۔

شمس الرحمن فاروقی بنیادی طور پر ایک دانش ور ہیں۔ اُن کی عالمانہ تصانیف کو پڑھ کر نیز ''شب خون'' جیسے معیاری رسالے کی ترتیب و تزئین کو دیکھ کر ہر کس و ناکس اُردو اور فارسی ادبیات پر اُن کی گرفت کی تعریف کرتا ہے۔ رسالہ ''شب خون'' جون ۲۰۰۵ء تک یعنی کم و بیش چالیس سال تک شائع ہوتا رہا۔ اگر چہ اِس میں بحیثیت مدیر، پرنٹر اور پبلشر عقیلہ شاہین کا نام درج ہوتا تھا، لیکن ترتیب و تہذیب کے ذمہ دار فاروقی تھے اور وہی دراصل پورے رسالے کی نگرانی کرتے تھے۔ ملازمت سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد وہ از اوّل تا آخر اسے سجاتے سنوارتے تھے۔ تقریباً ۸۰ صفحات پر مشتمل اس رسالے میں اعلیٰ درجہ کے طبع زاد نثری مضامین کے علاوہ مختلف زبانوں کے تراجم اور ادبی مباحث بھی ہوتے تھے۔ منظومات کے علاوہ چند مستقل عنوانات مثلاً ''سوانحی گوشے''، ''کہتی ہے خلقِ خدا'' اور ابتدائیہ میں ادبِ عالیہ کا کوئی تعارفی مضمون ضرور ہوتا تھا۔ اس رسالے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ نہ تو کوئی مضمون قسطوں میں چھپتا تھا اور نہ مختلف الگ الگ صفحات پر۔ صحت کی خرابی اور دوسرے ناگزیر اسباب کی بنا پر فاروقی نے جون تا دسمبر ۲۰۰۵ء میں دو جلدوں پر مشتمل

آخری شمارہ نکال کر ''شب خون'' بند کر دیا۔

اشرف نقوی نے اپنی شاعری میں معاشرے کے اہم ترین موضوعات پر قلم اُٹھایا اور اُن کو معاشرے میں جس مقام پر بھی توازن بگڑتا ہوا نظر آیا، اس پر اُنھوں نے بڑے بے باک انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کسی بھی قسم کی مخالفت کی پروانہیں کی۔ اُن کا پہلا مجموعہ ''آخرش'' ہے اور دوسرا ''زادِ حرف''۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ایک اُستاد ہیں مگر اعلیٰ ظرف انسان ہیں۔ ہمیشہ اُنھوں نے خود کو ادب کا طالب علم سمجھا ہے۔ غزل ان کی پسندیدہ صنف ہے لیکن شخصیت ایک پورا دبستان ہے۔ اُنھوں نے حمد، نعت، سلام اور نظم میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی تصنیف ''آخرش'' سے اُن کے نمونہ کلام کی مثالیں دیکھیں:

جو میری سورۂ والعصر پر نظر ہوتی — میں ہر خسارے سے آگے نکل گیا ہوتا

اِک اِسمِ خاص کی یہ پڑھائی کا وقت ہے — سب مل کے دُہائی، دُہائی کا وقت ہے

روز اِس دشت میں کربل سی بپا ہوتی ہے — روز آتا ہے محرم کا مہینہ دل میں

صورتِ ربط یوں نکالیں گے — دل کو ہم دشت سے ملا لیں گے

اشرف نقوی ایک پختہ فکر رکھنے والے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری جو قاری پڑھتا ہے تو زندگی کا حُسن اُس کے سامنے عیاں ہو جاتا ہے۔ زندگی کے حسن کے خوب صورت عناصر اُبھر کر قاری کے سامنے آجاتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی اُن کی شاعری پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اشرف نقوی کی شاعری پڑھتے ہوئے پہلے تو آپ چونکتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ مسحور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کا روایتی ڈکشن پس منظر میں رہتا ہے اور اس کا جدید طرزِ احساس اس کے جذبے اور خلوص کے ساتھ آمیز ہو کر قاری کے دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ وہ محبت کی شاعری کرتا ہے تو یوں کہ محبت کی شاعری کرنے والوں میں نمایاں نظر آنے لگتا ہے۔''

(اشرف نقوی: ۲۰۰۶: ۲۹)

اشرف نقوی کی شاعری میں لفظ ''دشت'' کا بہت زیادہ استعمال ہوا ہے۔ نمونہ کلام دیکھیے:

بھٹکا ہوا راہی ہوں سرِ دشتِ تمنّا
بھولا ہوا صدیوں سے ہوں میں اپنا پتا بھی

اشرف نقوی کی غزل کے بارے میں شاہین عباس بیان کرتے ہیں:

''اشرف نقوی کی غزل ایک طرف قدامت اور اُس کے اسرار کا بیانیہ ہے اور دوسری طرف جدت اور اُس کے فشار کی کہانی۔ اس مجموعے کا خالق ثقافتی اور عصری تغیرات کو لحاظ میں رکھتے ہوئے اپنے شعری آہنگ کو بلند و پست کرتا ہے اور کہیں تاریخ و روایت پر استقامت کے ساتھ قانع اور مطمئن دِکھائی دیتا ہے۔''

اشرف نقوی کی شاعری میں دشت دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے:

روز اِس دشت میں کربل سی بپا ہوتی ہے
روز آتا ہے محرّم کا مہینہ دل میں

❁❁❁❁

صورتِ ربط یوں نکالیں گے
دل کو ہم دشت سے ملا لیں گے

❁❁❁❁

ہوا کے دل میں تھی مجھ سے نہ جانے کیا پرخاش
کہ دشت بھر میں اُڑاتی رہی غبار مِرا

❁❁❁❁

اندازہ کچھ نہیں تھا مجھے اُس کی پیاس کا
پچھتا رہا ہوں دشت میں دریا کو ڈال کے

وہ معاشرے کو درپیش معاشی مسائل کی دُہائی اِن الفاظ میں دیتے ہیں:

تمام عمر میں اِک گھر نہ بن سکا مجھ سے
میں خرچ ہوتا رہا بس مکاں بناتے ہوئے

اشرف نقوی کے مجموعۂ کلام آخرش'' میں دوستی اور محبت کے موضوع پر کئی اشعار ملتے ہیں۔اُن کی غزلوں میں غمِ جاناں اورغمِ دوراں کی رُوداد کم ہے تاہم محبت، عداوت، وفا، بے رُخی کے اظہار یے جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔اشرف نقوی زمانے سے کٹ کرنہیں رہ سکتے۔اُن کے کلام میں اُن کی مجلسی زندگی بولتی ہے۔سادہ اور عام فہم لفظیات اُن کے مدعائے کلام کو اور زیادہ پُراثر بناتی ہیں۔اُن کے کلام میں تنہائی کو سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اگر کوئی شاعر تنہائی کا احساس دِلادے تو یہ اُس کی لفظوں پر گرفت کا ثبوت ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

بھٹکا ہوا راہی ہوں سرِ دشتِ تمنّا
بُھولا ہوا ہوں صدیوں سے میں اپنا پتا بھی

ارشد نعیم لکھتے ہیں:

''اشرف نقوی نے غزل کے عمومی موضوعات کو اپنے دستِ ہُنر سے نیا بنانے کا کام کیا ہے۔روایت کی توسیع اور تعمیرِ نو کا کام بڑا کٹھن ہوتا ہے۔یونہی ذرا سی لغزش ہوئی اور شاعری ''کلیشے'' میں ڈھل گئی۔لیکن ''آخرش'' میں صورتِ حال اس سے مختلف نظر آتی ہے۔روایتی مضامین بھی اشرف نقوی کی تازہ کاری کے باعث تازہ دم اور نئے نظر آنے لگتے ہیں۔''
(اشرف نقوی:۲۱)

سُنا رہا ہے کہانی یہی ، غبار مِرا
مِلا ہوا ہے کسی دشت سے دیار مِرا

❁❁❁❁

تمھارے لمس سے محظوظ کس طرح ہوتے
کہ ہم کو خواب سے باہر بلا لیا گیا تھا

❁❁❁❁

ہم لوگ اگر گھر میں چراغوں کو جگہ دیں

جل جائیں حسد سے در و دیوار ہمارے

❁❁❁❁

وقت کو بھی کتاب میں ہم نے
مور کا پر بنا کے رکھا ہے

اشرف نقوی کے مجموعۂ کلام کو پڑھتے ہوئے کہیں پر بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کسی شاعر کا اوّلین شعری مجموعہ ہے بلکہ یہ کسی قادرالکلام شاعر کا کلام محسوس ہوتا ہے۔مجموعے میں موجود تمام غزلیں بڑی مرصّع ہیں۔شاعر کا لہجہ توانا اور پُختہ ہے۔اشرف نقوی کی شاعری پر وحید احمد زمان کہتے ہیں:

''اشرف نقوی کی شاعری ویسی ہی ہے جیسے وہ خود۔۔۔۔ اُن کی شاعری کے تمام سوتے اُن کی ذات سے پھوٹتے ہیں۔اُن کے جذبات و احساسات ان کی محرومیوں،ان کے کرب والم اور اس کی تھوڑی بہت خوشیاں جو کچھ بھی ہے اِس میں سچائی ہے۔یہ شاعری اس کی شعری تخلیقات میں پوری آب وتاب سے جلوہ افروز ہے۔
(فرسٹ آپشن،شمارہ:دسمبر ۲۰۰۶ء،صفحہ ۵۶)

اشرف نقوی نے ہر موضوع پر نہایت خوب صورت شعر کہے لیکن مجموعی طور پر ان کی شاعری میں احساسِ محرومی کی شدت کا احساس بھرپور طریقے سے اُبھر کر سامنے آتا ہے۔خاص طور پر وہ اپنے ادُھورے پن کا شکار نظر آتے ہیں۔وہ تکمیلِ ذات کے شدید متمنی لگتے ہیں۔
اُن کے چند اشعار دیکھیے:

اِسی لیے تو ابھی تک میں نامکمل ہوں
ادُھورا چاک سے مجھ کو اُٹھا لیا گیا تھا

❁❁❁❁

کچھ کارِ ہُنر کوزہ گرا! میرے ، دکھا بھی
مٹی ہوں ، مجھے گُوندھ ، مجھے چاک پہ لا بھی

❁❁❁❁

مسمار کیسے جاتے ہیں معمار ہی ہم کو
کب جانے مکمل کریں تعمیر ہماری

❁❁❁❁

اے دستِ ہُنر تیرا ہی اعجاز ہے شاید
بننے بھی نہیں پائے کہ مسمار ہوئے ہم

❁❁❁❁

گم ہوئے ایسی حیرتوں میں ہم
اب جہاں ہیں ، وہیں پہ زندہ ہیں

❁❁❁❁

بات کرے گی خاک مِری
آج مِرے کُوزہ گر سے

❁❁❁❁

ہوں اُدھورا ، مجھے مکمل کر
مجھ کو مالک! گزار مٹی سے

❁❁❁❁

اِس سے پیکر بناؤں گا اپنا
یہ جو مٹی بھگو رہا ہوں میں

اشرف نقوی کی شاعری کا مجموعہ ''کرب والم کی صورت دِکھائی دیتا ہے۔ دُکھوں کے تمام استعارے ان کے مجموعہ کلام میں بکثرت مل جاتے ہیں۔ شاعر یاسیت کے اندھیروں میں بھٹکتا ہوا

دکھائی دیتا ہے۔ وہ ان اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے دُعا بھی کرتا ہے کہ:

میری تقدیر میں بھی خالقِ نُور!
کوئی جُگنو ، کوئی دِیا کر دے

لیکن یاسیت کے اندھیرے ان کی جان نہیں چھوڑتے۔ نجانے انھیں اپنی دُعائیں بابِ اثر تک رسائی حاصل کرنے میں ناکام کیوں دِکھائی دیتی ہیں؟

زباں سے نکلی تو لب تک صدا نہیں پہنچی
کبھی فلک پہ مِری التجا نہیں پہنچی
ہمارے ہاتھ ازل سے اُٹھے ہوئے ہیں ، مگر
قبولیت کے نگر میں دُعا نہی پہنچی

❁❁❁❁

میں اپنے ہاتھ اُٹھاؤں تو کس طرح اشرف
بچھڑ رہی ہے مِرے لب سے ہر دُعا اب کے

دُعاؤں کو شرفِ قبولیت نہ ملنے کے ڈر سے دُعا کرنے کا عمل ترک نہیں کر دینا چاہیے بلکہ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ یہ بات حوصلہ افزا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

اِک تعبیر کی خواہش میں
خواب نگر تک پہنچا ہوں

یہی وہ خواب نگر ہے جہاں امیدوں کے چراغ روشن ہیں، جہاں آرزوؤں کے پھول کھلتے ہیں، جہاں دل کے موسم بدلتے ہیں۔

اشرف نقوی کے مجموعہ ''زادِ حرف'' پر نظر ڈالیں تو پتا چلتا ہے کہ اشرف نقوی علامہ اقبال کی طرح محبوب سے قربت نہیں مانگتا۔ محبوب کے ہجر میں سلگنے کو حقیقی عشق کہتا ہے۔ محبوب کے دیے

ہوئے ستم اور غم سے لطف اندوز ہونے کا ہُنر اشرف خوب جانتا ہے۔ کرب میں قُرب کا مزا تو سچا عاشق جانتا ہے۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اکثر شعراء کی غزلوں کی معنویت کُلی ایک جیسی ہوتی ہے مگر اشرف نقوی کی شاعری میں یہ خوبی ہے کہ اس کے ہر شعر کی معنویت منفرد وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ غزل کا کرافٹ بھی اُس وقت بلند ہوتا ہے جب ہر شعر اپنی علیحدہ معنویت رکھتا ہو۔ اشرف نقوی کی شاعری میں مزاحمت کے ساتھ قدامت پسندی کا عنصر بھی واضح ہے اور جدت کی طرف بڑھتا ہوا جنون بھی ہے۔ اشرف نقوی مکمل طور پر ادبی رموز کو سمجھتے ہوئے سرائیکی زبان کے صوفی شاعر حضرت خواجہ غلام فرید کے اِس شعر کی لائن پر کاربند ہے:

تھک نہ بہہ تے ناہار فریدا!
نِت یار دا دہرا پرے تو پرے

اشرف نقوی کا یہ شعر دیکھیں:

عالمِ بے کنار تجھ سے ہے
لفظِ کُن کی پکار تجھ سے ہے

اشرف نقوی خود کو عشقِ رسولؐ میں خاک کرتے ہوئے کہتا ہے:

کچھ اِس طرح میں قدم بوسی کا شرف پاؤں
کہ خاکِ طیبہ میں مل جائیں جسم و جاں آقا!

معرکۂ کربلا کے فاتح امامِ عالی مقامؑ سے عقیدت کا اظہار کچھ اِس طرح کرتے ہیں:

جوڑی جائے حسینؑ سے نسبت
ربط دُنیا سے کم کیا جائے

اگر شاعر اور دانش ور ایمان داری سے سچ لکھنا شروع کر دیں تو اشرف نقوی کے اِس شعر کی بھرپور تائید ہوگی:

ہم وقت کے سرمد بھی ہیں منصور بھی اشرف
گونجے گی ہر اِک دَور میں آواز ہماری

اشرف نقوی ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''جب شاعری کی ابتدا کی اُس وقت تو کسی خاص رائٹر نے متاثر نہیں کیا لیکن بعد میں مجھے ناصر کاظمی، احمد فراز اور مجید امجد کی شاعری نے کافی متاثر کیا لیکن میری کوشش یہی رہی ہے کہ میں ان میں سے کسی کی چھاپ اپنے اوپر نہ آنے دُوں۔''
> (میگزین ''گوشۂ ادب''، چیف ایڈیٹر: جلیل اختر، ۳۰ جون ۲۰۱۴ء)

اشرف نقوی نے زندگی کی بے حسی پر بہت سی نظمیں اور اشعار لکھے ہیں۔ شاعر زندگی کے سفر میں ٹھہراؤ سے اُکتاہٹ محسوس کرتا ہے اور اُسے اپنے چاروں طرف ہر شے زندگی سے خالی نظر آتی ہے۔ ہر طرف ایک ہی منظر، ایک جیسی صورتِ حال، یہ منظر تبدیل ہونا چاہیے۔ کوئی نئی بات، کوئی نیا ہنگامہ زندگی ہے ۔

میں بھی ایسا ہی ایک منظر ہوں
اپنی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا
ایک تصویر کی طرح ساکت
سوچ مفلوج، جذبے پژمُردہ
سانس جیسے حلق میں اٹکی ہوئی
اور پہلو میں دل، مگر پتھر!
گویا پورا وجود ہی شل ہے
ایک منظر ہر ایک سمت رواں
ہر طرف ایک سی کہانی ہے

اشرف نقوی کی شاعری میں موضوعاتی اور فکری اعتبار سے جو تخلیقی تنوع پایا جاتا ہے وہ آپ کو اپنے ہم عصر شعراء سے منفرد اور ممتاز کرتا ہے۔ داخلی غم کا عنصر ہو یا آفاقی مسائل کا درد، موصوف کی شاعری شعری آہنگ میں شدتِ احساس کی ناقابلِ بیان تمازت لیے ہوئے ہے۔ اشرف نقوی کہتے ہیں:

اے دستِ ہُنر تیرا ہی اعجاز ہے شاید
بننے بھی نہیں پائے کہ مسمار ہوئے ہم

ذرا یہ شعر بھی دیکھیے:

دل کسی اور ہی منظر میں نظر آئے گا
یہ ستارہ نہیں آفاق میں کھونے والا

❁❁❁❁

نہیں کچھ بھی، مگر ہونے کا اپنے
مجھے کچھ کچھ گماں ہونے لگا ہے

اشرف نقوی کی شاعری پڑھتے وقت شاعر کے اندر چھپا ہوا درد بار بار اُبھر کر قاری کے سامنے آتا ہے اور وہ پوری شدت کے ساتھ دُکھ اور کرب کی لہریں درونِ دل اُٹھتی ہوئی محسوس کرتا ہے۔ نقوی صاحب کی شاعری کا سارا منظرنامہ اِنھی کیفیات کی صورت میں تشکیل پاتا ہے جس کا تعلق اس کے اندر چھپے ہوئے ایک دردمند اور حساس انسان کے ساتھ ہے۔

تمھارے جانے کا غم ہے، نہ ہے خوشی کوئی
تمھارا غم بھی غمِ رائیگاں میں آیا ہے

بقول اظہر عباس:

''اشرف نقوی کی شاعری میں ''دشت'' دور تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ اصل

میں یہ استعارہ اُس ویرانی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اشرف نقوی کی ذات میں پنہاں ہے۔جس کا اِظہار وہ کچھ اِس انداز سے کرتا ہے:

ریگِ صحرا کی طرح خشک ہیں آنکھیں اشرف
کوئی دریا بھی نہیں اِن کو بھگونے والا

شاعر،شاعر بھی ہو اور حسینی بھی تو دشتا س کی شاعری کا خاص حوالہ بن جاتا ہے۔وہ اپنے عہد کو واقعہ کربلا کے حوالے سے دیکھتا ہے تو یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ:

روز اِس دشت میں کربل سی بپا ہوتی ہے
روز آتا ہے محرّم کا مہینہ دل میں

ایک طرف کربلا میں معصومین پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کو یاد کر کے اشرف نقوی کی آنکھیں فرات کی طرح بہنے پر مجبور ہیں تو دوسری طرف ایک صدائے لااِلہٰ بھی ہونٹوں پر رواں دواں نظر آتی ہے۔جیسے یہ شعر۔
ملاحظہ کیجیے:

آنکھ میں اِک فرات بہتا ہوا
اور ہونٹوں پہ کربلا روشن

واقعہ کربلا میں شہیدوں کے سروں کو نیزوں پر لہرانے کا دل خراش عمل ہر عہد کے شاعر نے اِس انداز سے قلم بند کیا ہے مگر اشرف نقوی اس منظر کو اپنے ہی رنگ میں دیکھتے ہیں:

نیزوں پہ لگ رہا تھا سروں کی بہار سے
صحرائے تیرگی میں شجر روشنی کا ہے

بات دشت کی ہو رہی ہے تو دشت کے حوالے سے عرفان صدیقی کے ایک شعری حوالہ کے طور پر ملاحظہ کریں:

ریت پر تھک کے گرا ہوں تو ہوا پوچھتی ہے
آپ کیوں آئے تھے اِس دشت میں وحشت کے بغیر

اظہر عباس کے بقول:

''جہاں تک اشرف نقوی کو ہم جانتے ہیں اور جتنا جانتے ہیں اس کا خلاصہ صرف اِتنا ہے کہ شریف آدمی ہے اور شریف بھی ایسا کہ آج تک عشق کو مزے لے کر سُنانا تو درکنار، اِشاروں کنایوں میں بھی بیان نہیں کیا۔ وہ تو ان کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنے حضرت ہیں؟ پہلوان جیسے سینے میں چڑیا جیسا نرم و نازک دل لیے پھرتے ہیں جو آبگینوں کو ٹھیس لگنے کے انتظار میں پڑا مچلتا رہتا ہے۔ باوجود اِس کے کہ اس کے کسی عشق کا فسانہ اُس گلی تک پہنچا نہ ہم تک مگر ان کی شاعری میں ہجر کا استعارہ ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔''

ہمِیں نے دینِ محبت جہاں میں پھیلایا
ہمِیں پہ تُہمتِ یاراں کہ بے عقیدہ ہیں

ہر عہد کے شعراء کی طرح اشرف نقوی بھی میر تقی میرؔ سے متأثر ہیں۔ انھوں نے بھی میر کی شعری عظمت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

لفظ تاثیر سے الگ رکھا
شعر جو میر سے الگ رکھا

❁❁❁❁

رنج شعروں میں ڈھالنا اشرف
میر صاحب سے استفادہ ہے

❁❁❁❁

نہ اب ہے میرؔ سا رنگِ سُخن ، نہ غالب سا
کہ جب سے روٹھ کے اہلِ زباں چلے گئے ہیں

''آخرش'' ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی اور اِس کو بیت الحکمت کے زیرِ اہتمام موٹر وے پریس، لاہور سے طبع کیا گیا۔ اِس کے ۱۷۶ صفحات ہیں اور انتساب ''حسنین اور وجیہہ'' کے نام ہے

جو اشرف نقوی صاحب کے فرزند اور دُختر ہیں۔ اِس کا مقدمہ ''شاہین عباس'' نے لکھا ہے۔ اِس کتاب کے شروع میں حمد، نعت اور منقبت موجود ہیں اور اللہ کی حمد و ثنا کی گئی ہے۔

اشرف نقوی کی حمد کا پہلا شعر یہ ہے:

ذکر کرتی رہے بیاں تیرا
لب پہ ہر دم رہے بیاں تیرا
تیری قدرت سے کچھ نہیں باہر
ہے مکاں تیرا ، لامکاں تیرا

(صفحہ ۱۷)

خدا اور اُس کے رسول کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے:

میری ہستی کی تیرہ شب کے لیے
آپؐ ماہِ تمام ہیں آقاؐ!
اپنی قسمت پہ کیوں نہ ناز کریں
ہم تمھارے غلام ہیں آقاؐ!

(صفحہ ۲۰)

اللہ اور رسولؐ کی مدحت بیان کرنے کے بعد شہیدانِ کربلا اور محمدؐ و آلِ محمدؐ کو سلامِ عقیدت پیش نہ کیا جائے تو ایمان ادھورا سا رہتا ہے۔ اِس سلسلے میں ایک سلام اشرف نقوی کا اِس کتاب کی زینت بنا ہوا ہے جس کے اشعار درجِ ذیل ہیں:

دیوار روشنی کی ہے ، در روشنی کا ہے
کربل میں خیمہ زن ہے جو گھر روشنی کا ہے
نیزوں پہ لگ رہا تھا سروں کی بہار سے

صحرائے تیرگی میں شجر روشنی کا ہے
(صفحہ ۲۱)

اشرف نقوی چونکہ سادات گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں اِس لیے اُن کے ہاں کربلا کا استعارہ اور امام حسینؑ سے محبت کے اشعار جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔

اشکِ غمِ حُسین کی تاثیر دیکھیے
ہاتھوں میرے آج ہُنر روشنی کا ہے

اشرف نقوی کے ہاں تصوّف کا عنصر صاف دِکھائی دیتا ہے۔ان کے اشعار کا پس منظر خدا پر یقین اور اُمید پر ہے۔اللہ کی وحدانیت کا اعتراف بھی اُن کے ہاں نظر آتا ہے۔تصوّف اور اس کے معاملات اُردو شاعری کے اہم ترین موضوعات میں سے رہے ہیں۔عشق میں فنائیت کا تصور دراصل عشقِ حقیقی کا پیدا کردہ ہے۔ساتھ ہی زندگی کی عدم ثباتی انسانوں کے ساتھ رواداری اور مذہبی شدت پسندی کے مقابلے میں ایک بہت لچک دار رویّے نے شاعری کی اِس جہت کو بہت ثروت مند بنایا ہے۔دیکھنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ تصوّف کے مضامین کو شعراء کس فنی ہنرمندی اور تخلیقی احساس کے ساتھ خالص شعر کی شکل میں پیش کیا ہے۔

تصوّف سے متعلق اشرف نقوی کا یہ شعر ملاحظہ کریں:

کُن کا سارا وقار مٹی سے
ہے خدا کو بھی پیار مٹی سے

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

ہوں ادھورا، مجھے مکمل کر
مجھ کو مالک! گزار مٹی سے

اشرف نقوی بہت نرم اور حسّاس دل کے مالک ہیں اِس لیے اُن کی شخصیت کے اوصاف

صاف دِکھائی دیتے ہیں۔ ''زادِحرف'' اشرف نقوی کا دوسرا مجموعہ ہے جو کہ جنوری ۲۰۱۵ء شائع ہوا اوراس کی اشاعت ''انحراف پبلی کیشنز'' کی طرف سے ہوئی ہے۔ کتاب کے ایک سو ساٹھ (۱۶۰) صفحات ہیں۔ انتساب اپنی ہم خانہ وہم نصیب روبینہ بخاری اور پیاری بیٹی شافعہ بتول کے نام کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر ضیاء الحسن کی طرف سے ایک مضمون ''اشرف نقوی کا استعاراتی نظام'' کے نام سے شائع ہوا ہے اور مقدمہ ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک نے لکھا ہے اور آخر میں اشرف نقوی نے ''خود کلامی'' کے عنوان سے اپنے شعری اور ادبی سفر کے حوالے سے چند معروضات تحریر کی ہیں۔

اشرف نقوی نے کتاب کا آغاز اِن اشعار سے کیا ہے:

یہ کارِ عشق ہے ، آتا ہے آتے آتے ہی
اور آ بھی جائے تو اکثر زیاں سے آتا ہے
میں دیکھتا ہوں اُسی کا بھرا ہوا دامن
جو خالی ہاتھ ، ترے آستاں سے آتا ہے
(صفحہ: ۲۲)

اس کے بعد حمد یہ اشعار ملتے ہیں:

عالمِ بے کنار تجھ سے ہے
لفظِ کُن کی پکار تجھ سے ہے
(صفحہ: ۲۳)

''کُن'' کا استعارہ اشرف نقوی کی غزلوں کا خاصہ ہے۔

میرا ہونا اِس عالمِ کُن میں
باعثِ افتخار تجھ سے ہے
(صفحہ: ۲۴)

عالمِ کُن میں میں نہیں تھا مگر
میرے ہونے کی تھی خبر موجود
(صفحہ:۶۲)

اشرف نقوی کے ہاں مذہبی عنصر چھایا ہوا ہے۔ اللہ سے امید اور دُعا کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں:

مولا! مثالِ عیسیٰؑ سرِ آسماں اُٹھا
ہونے لگا ہے اب تو خسارہ زمین پر
مالک! تِرے جہاں میں اگر کچھ کمی نہیں
پھر کیوں نہیں ہے کچھ بھی ہمارا زمین پر
(صفحہ:۷۴)

کربلا والوں سے محبت اور امام حسینؑ سے عقیدت کی مثال جگہ جگہ ملتی ہے۔ عاشورہ کے دن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پورا کُنبہ شہید کر ڈالا گیا اور یزیدی لشکر کی بربریت عروج پر تھی۔

دشت ہے ، دریا ہے اور فوجِ یزید
کربلائے بے اماں ہے اور میں
خشک دریا پیاس سے ہے جاں بہ لب
آنکھ میں اشکِ رواں ہے اور میں
(صفحہ:۶۸)

شامِ غریباں کے وقت اور آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹیاں، بہوئیں بے آسرا اور بے یارو مددگار تھیں اور مرد حضرات شہید ہو چکے تھے۔ اشرف نقوی اِس منظر کو اشعار میں اِس طرح بیان کرتے ہیں:

ہائے وہ جلتے خیمے ، وہ بچے ، وہ بیبیاں
ہائے وہ وقتِ شامِ غریبانِ کربلا

(صفحہ:۲۹)

''دشت'' اشرف نقوی کی شاعری میں بہت زیادہ ہے۔ ذات کی ویرانی کا پہلو اُن کے اشعار میں بہت زیادہ نظر آتا ہے۔ ''دشت'' کے حوالے سے اشرف نقوی کا شعر ملاحظہ کریں:

آیا ہوں بھرے شہر سے اِک دشت کی جانب
اِک ہجر لیے نقل مکانی کے علاوہ

(صفحہ:۳۱)

ایسا لگتا ہے کہ اشرف نقوی کو صحرا سے زیادہ لگاؤ ہے اور لوگوں کے ہجوم سے دُور بھاگتے ہیں:

یونہی روتے روتے اِک دن
دشت بھگویا جا سکتا ہے

(صفحہ:۳۷)

ایسا لگتا ہے کہ اشرف نقوی کے اندر بہت ویرانی اور ماضی کی تلخ یادیں ہیں جو اس کو اندر سے بے چین رکھتی ہیں۔

دریا بڑھا تھا میری طرف طمطراق سے
اِک دشت تھا ، سو پیاس بجھا کر میں سو گیا

(صفحہ:۴۷)

وہ حکایت کہ جو تحریر سرِ مژگاں ہے
کاش! سُن لیتا کوئی میری زبانی مجھ سے

(صفحہ: ۸۶ آخرش)

اپنے جنوں کی بات وہ اِس طرح کرتے ہیں:

اِس درجہ یگانہ ہوئے ہم اپنے جنوں میں
ہر دشت میں پہنچی ہوئی وحشت تھی ہماری
(صفحہ ۹۷،آخرش)

اشرف وہ کیے راز عیاں ہم پہ جنوں نے
حیرت میں کئی روز سے حیرت تھی ہماری
(صفحہ:۹۸،آخرش)

اشرف نقوی کے ہاں میرؔ و غالبؔ کے رنگ کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ میر و غالب ایک دبستان ہیں جس سے ہر دور کے شاعر متأثر ہوئے ہیں۔ اُن جیسی شاعری اب تک کوئی نہ کر سکا۔ اِس حوالے سے اشرف نقوی کہتے ہیں:

نہ اب وہ میر سا رنگِ سخن ، نہ غالب سے
کہ جب سے رُوٹھ کے اہلِ زباں چلے گئے ہیں

تخلیقی ادب میں عموماً اور غزلیہ شاعری میں خصوصاً یہ ضروری نہیں ہے کہ شاعر غزل میں جس امر کا اظہار کرے وہ اُس کی اپنی فکر کا نتیجہ ہو، یا وہ اُس کے ذاتی تجربات اور احساسات کا اظہار ہو۔ کئی بار شاعر دوسروں کے تجربات و احساسات کی بھی بیان کرتا ہے اور کبھی کبھی وہ روایتی مضامین کو رسماً بیان کرتا ہے اور اپنے تخیّل سے اس میں نیا مضمون پیدا کرنے کوشش کرتا ہے لیکن اِس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ غزل کا شاعر جن خیالات یا احساسات کا بیان کرتا ہے، اُس کا اُس کی زندگی یا حقیقت سے بالکل ہی کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ دراصل شاعر سامنے کی حقیقت کو اپنے تخیّل کی آمیزش شے ایک نئی حقیقت کی تخلیق کرتا ہے۔ غالب ہو یا میر، سب نے شاعری کے لیے ''دشت نوردی'' کی ہے۔ اچھی شاعری خونِ جگر کا کام کرتی ہے۔ احساس اور جذبات کی مرقع نگاری کو شعری قالب میں ڈھالنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ غالب کہتے ہیں:

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

اسی طرح اشرف نقوی اِس بات کو اپنی شاعری میں اِس طرح کہتے ہیں:

شاعری گویا کہ ہے دشت نوردی اشرف
سو یہاں خاک اُڑانے کے لیے آیا ہوں

ص:۱۳۹، زادِحرف)

مسلسل جستجو، مشاہدہ، بھاگ دوڑ اور دشت نوردی سے ہی اچھی شاعری تخلیق ہوتی ہے۔ مسلسل کھوج اور خود کو پا لینے کی جستجو کا عمل ہر لمحہ جاری رہتا ہے، تب جا کر وہ اشعار سامنے آتے ہیں جن کو سُن کر صاف نظر آتا ہے کہ گویا دل کی بات زبان پر آنا!

اشرف نقوی ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

سوچا تھا کہ اِک دشت کو سیراب کریں گے
بے کار گئی ہائے ، تگ و تاز ہماری

(صفحہ:۶۴)

محبوب کا فراق اور اُس سے جدائی عاشق کے لیے تقریباً ایک مستقل کیفیت ہے۔ وہ عشق میں ایک ایسے ہجر کو گزار رہا ہوتا ہے جس کا کوئی انجام نہیں ہوتا۔ یہ تصوّر اُردو کی کلاسیکی شاعری کا بہت بنیادی تصوّر ہے۔ شاعروں نے ہجر و فراق کی اِس کہانی کو بہت طول دیا اور نئے نئے مضامین پید کیے۔ ہجر و فراق کا ذکر ان کے اشعار میں بہت جگہ ملتا ہے۔ لگتا ہے جیسے اشرف نقوی کسی ایسے شخص کا حال بیان کر رہے ہوں جس کا محبوب اُس کو چھوڑ کر جا رہا ہو۔

اشرف مِرے لیے تو قیامت کی ہے گھڑی
یہ وقت جو کسی سے جدائی کا وقت ہے

ایک جگہ ہمیں اُن کے اشعار کچھ اِس طرح نظر آتے ہیں:

ہجر سے جو ملا کے رکھا ہے
غم وہ جگنو بنا کے رکھا ہے
تیری راہوں میں اِک دیا ہی نہیں
ہم نے دل بھی جلا کے رکھا ہے

(صفحہ ۱۳۵، آخرش)

حوالہ جات

۱)۔ سرور الہدیٰ، ڈاکٹر، ''نئی اُردو غزل''، بیکن بکس، ملتان، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۰۱

۲)۔ ایضاً۔ ص: ۱۱۲

۳)۔ عطاء الحق قاسمی، تاثرات (فلیپ) ''آخرش''، لاہور، بیت الحکمت، ۲۰۰۶ء

۴)۔ عبادت بریلوی، ''جدید شاعری''، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۳ء

۵)۔ وحید احمد زمان، ''اشرف نقوی کی شاعری پر ایک نظر''، ماہنامہ فرسٹ آپشن، لاہور، دسمبر ۲۰۰۶ء، ص: ۵۶

۶)۔ ارشد نعیم، ''آخرش اور جدید غزل کا فن''، ماہنامہ ادب دوست، لاہور، جون ۲۰۰۸ء

۷)۔ علی آصف، پروفیسر، ''نسلِ گمشدہ اور زادِ حرف''، ''مرغزار''، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج شیخوپور، شمارہ ۱۸۔ ۲۰۱۷ء

۸)۔ نعیم گیلانی، ''آخرش، اشرف نقوی کا نقشِ اوّل''، تحقیقی مقالہ مظہر علی ورک

۹)۔ ارشد نعیم، ''اشرف نقوی اور ''زادِ حرف''، ماہنامہ ادب دوست، لاہور، ستمبر، ۲۰۱۵ء

باب نمبر ۳

''اشرف نقوی کی غزل کا فنی جائزہ''

شعری اصناف میں غزل ایک ایسی صنف ہے جس کی ہیئت سب سے زیادہ بحث کا موضوع رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نظم کی جتنی شکلیں ہمارے یہاں موجود ہیں اُن میں ہیئت کی سطح پر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور ان تبدیلیوں پر کوئی خاص ردِ عمل نہیں ہوا۔ ہیئت کے سلسلے میں ناقدینِ فن اور علمائے ادب کی رائے ایک نہیں ہے۔

لغوی معنی میں کسی شے کی شکل وصورت کو ''ہیئت'' کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اِس سے لفظ ''ہیئت'' کا مفہوم بہت محدود ہو جاتا ہے۔ کچھ ''اہلِ ہیئت'' کو وسیع معنی میں استعمال کرتے ہوئے کسی اس صنف سے وابستہ تمام داخلی اور خارجی اشیاء کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔

مغربی تنقید نگاروں کے ہاں یہ لفظ بالعموم اسی دوہری معنویت کا حامل دِکھائی دیتا ہے۔ مروّجہ اصطلاحی مفہوم کے اعتبار سے صنف اور ہیئت ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ صنف کا تعلق کسی فن پارے کے مواد اور موضوع سے ہے جب کہ ہیئت کسی تخلیق کے ظاہری ڈھانچے اور صورت کا نام ہے۔ اُردو ادب میں اگرچہ صنف اور ہیئت انھی مروّجہ معنوں میں مستعمل ہیں تاہم بعض اوقات یہ اصطلاحیں یوں باہم آمیخت ہو جاتی ہیں کہ ان کی علاحدہ (علیحدہ) شناخت اور انفرادی حیثیت گم ہو جاتی ہے اور ہیئت صنف کے لیے اور صنف ہیئت کے لیے استعمال ہونے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر غزل بہ یک وقت صنف بھی ہے اور ہیئت بھی۔ کیوں کہ یہ دونوں حیثیتیں اِس کے وجود میں ضم ہیں لیکن جب مروّجہ مفہوم کے مطابق ہم اِس کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ غزل صنف نہیں ہے کیونکہ صنف کا تشخص مواد اور موضوع سے ہے۔

ابتداء میں جب غزل محض عشقیہ ماحول کی ترجمان تھی اُس وقت تک اِسے صنف کہنے میں تأمل نہیں ہو سکتا تھا مگر اب جب کہ غزل کے دائرۂ موضوعات میں پوری انسانی زندگی اور اس کے

میلانات وامکانات شامل ہو چکے ہیں، اِس لیے اِس کو کسی محدود دائرے میں مقیّد نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کے برعکس غزل کا نام سُنتے ہی ہمارے ذہن میں اس کا ظاہری ڈھانچہ جلوہ گر ہونے لگتا ہے۔ احتشام حُسین اِس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''ہیئت اپنے وسیع مفہوم میں ایک طرف تو وہ طریقۂ اظہار ہے جو فنکار استعمال کرتا ہے۔ دوسری جانب جذبات سے بھرا ہوا پُر اثر اور کسی حد تک مانوس اندازِ بیاں ہے جو شاعر اور سامع کے درمیان رابطے اور رِشتے کا کام دیتا ہے۔ اس میں زبان کی تمام آرائش اثر انگیزی کے تمام طریقے، مواد کے تمام سانچے حسن اور لطافت پیدا کرنے کے تمام ذریعے ان سب سے بڑھ کر مواد کے ساتھ ہم آہنگی کا احساس دلا کر ایک مکمل فنی نمونہ پیش کرنا، سبھی کچھ شامل ہے۔''

یہ بات بالکل درست ہے کہ ہر دور اپنے موضوعات اور اپنے اسالیب اپنے ساتھ لاتا ہے۔ بقول کلیم عاجز:

تُو جو آیا تو پھر آباد ہوئی بزمِ غزل
میرا اندازِ سخن بھی تیرے شامل آیا

ویسے تو ہر غزل اپنے سے پیشتر کے مقابلہ میں جدید ہے مگر یہاں فکری اعتبار سے جدت مراد ہے جسے ماہرینِ فن نے جدید غزل کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اِس کی ابتدا غالب کے دور میں ہی ہو چکی تھی مگر باضابطہ اِس تحریک کا آغاز حالؔی کے ''مقدمۂ شعر وشاعری'' کے منظرِ عام پر آنے کے بعد ہوتا ہے۔ غزل کے اندر اصلاحی مضامین اور نت نئے افکار داخل کرنے کی حالؔی کی کوشش نے کامیابی کی طرف قدم بڑھایا اور شاد عظیم آبادی، جلال لکھنوی، ثاقب عزیز اور چکبست وغیرہ نے اِس کا نقشِ اوّل تیار کیا اور حسرت موہانی، اصغر، فانی، جگر، یگانہ اور فراق وغیرہ نے اپنے بلند و بالا افکار و خیالات اور نئے احساسات وجذبات سے نہ صرف غزل کو سرسبز وشاداب کیا بلکہ اِس روایت کی تجدید وتوسیع کی جس کی ابتداء حالی نے کی تھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ فکری عناصر کیا تھے جن کی وجہ سے غزل کی دُنیا میں اِتنا بڑا انقلاب آیا اور وہ جدت وندرت سے ہمکنار ہوئی تو اس کا آسان سا ایک جواب دیا جا سکتا ہے کہ زمانہ اور ماحول کا ادب پر ضرور اثر ہوتا ہے۔ حالی نے بھی غزل کی قدیم روایات کو توڑنے اور نیا باب قائم کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے اور غزل میں بھی عشق و عاشقی کے مضامین کے علاوہ فلسفیانہ خیالات وافکار اور حیات و کائنات کے مسائل شامل ہونے لگے۔ جن شعراء نے غزل کو نئی جہات عطا کیں اُن میں اہم نام شاد، اقبال، حسرت، فانی، اصغر، جگر، یگانہ، مجروح، فراق اور فیض وغیرہ کے ہیں۔ اِن حضرات نے غزل کے موضوعات کو کافی وسیع کیا۔ اس کے بعد مارکسی تحریک سے متأثر ہوکر ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ یہاں عوامی مسائل غزل میں شامل ہونے لگے پھر اس کے ردِ عمل میں حلقہ اربابِ ذوق کا قیام عمل میں آیا۔ ان حضرات نے بھی غزل میں تبدیلیاں کیں مگر آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک کے ماند پڑ جانے کے بعد مغربی فلسفہ کے زیر اثر جدیدیت کا آغاز ہوا۔ اِس رُجحان سے وابستہ شعراء نے اپنے داخلی احساسات اور اپنے آزادانہ افکار کو بروئے کار لاکر زندگی کی محرومیوں، ناکامیوں اور خوشیوں کو غزل میں شامل کیا، پھر مابعد جدیدیت کا قیام عمل میں آ گیا اور کچھ شعراء نے اِس تحریک سے وابستہ ہو کر غزلیں لکھ کر ایک الگ شناخت قائم کرنے کی کوشش کی۔ ان تمام رُجحانات اور تحریکات سے اندازہ ہوتا ہے کہ غزل میں ہر دور میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔

جدید غزل کے اِس دور میں اشرف نقوی کا شمار اُن معروف شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنا شعری سفر بہت تیزی سے طے کیا ہے۔ ان کے کلام میں کلاسیکیت کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر کا سماج سرگوشیاں کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کا کلام ایک طرف فنی پختگی کا ثبوت فراہم کرتا ہے تو دوسری جانب اسلوب کی تازہ کاری کا لطف بھی دیتا ہے۔ اشرف نقوی کی زیادہ تر غزلیں چھوٹی بحر میں ہیں مگر ان کا تخیل بلند پائے کا ہے۔ ان کے چند الفاظ کا چناؤ ملاحظہ ہو:

تیرے چرچے کیے جہاں بھر میں
خود کو تشہیر سے الگ رکھا
آیتِ حُسن کی تلاوت کو
حُسنِ تفسیر سے الگ رکھا

اشرف نقوی کا تعلق شیخو پورہ سے ہے۔ان سے پہلے شیخو پورہ سے شاہین عباس، ارشد نعیم اور نوید رضا اپنی شعری صلاحیتوں کی داد اہلِ ادب سے وصول کر چکے ہیں۔گلوبلائزیشن نے عمومی طور پر انسانی شعور میں جو اضافہ کیا ہے، بڑے شہروں اور مضافات کی تفریق کا خاتمہ بھی اس میں شامل ہے۔

اشرف نقوی کی شاعری میں مذہبی شعور کا اظہار صرف اُن اشعار میں ہی نہیں ہوا جن میں مذہب کی پیدا کردہ تہذیب سے تلمیحاتی استعارات وضع کیے ہیں بلکہ ان کی ساری شعری منطق اور تخلیقی تجربہ اسی مخصوص شعور کے زیرِ اثر کارفرما ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اشرف نقوی کے ہاں واقعہ کربلا سے منسلک استعارے فراوانی سے استعمال ہوئے ہیں۔ ہمارے عہد کو بیان کرنے کے لیے یہ بہترین استعارے ہیں کیونکہ اِس زمانے میں ان کو وہی مسائل درپیش ہیں جو حق کا استعارہ ہیں اور جو میدانِ کربلا میں اہلِ حق کو درپیش تھے۔

آج بھی اقتدار پرستی اور اس سے پیدا ہونے والے منفی رویوں نے ہماری زندگی کو اِس طرح بدصورت بنا دیا ہے جیسا کہ آج سے چودہ سو سال پہلے ہوا تھا۔مُٹھی بھر انسان ہمیشہ سے ظلم اور استحصال کے خلاف نبرد آزمائی کرتے آتے ہیں۔ اگرچہ بہیمیت اور حیوانیت کو وقتی طور پر کامیابی حاصل ہو جاتی ہے لیکن آخر فتح ہمیشہ حق کو ہی حاصل ہوتی ہے۔

نیزے پہ سر ہے اور بدن تپتی ریت پر
مقتل سے ہو کے نکلے ہیں عزت مآب ہم

❁❁❁❁❁

سہا وہ ظلم کہ اب کچھ پتا نہیں چلتا
ہمارے ہاتھ قلم ہیں کہ سر بُریدہ ہیں

❁❁❁❁❁

بلایا اِتنے تسلسل سے اہلِ کوفہ نے
مجھے نکلنا پڑا آخرش مدینے سے

❁❁❁❁❁

دشت ہے ، دریا ہے اور فوجِ یزید
کربلائے بے اماں ہے اور میں

❁❁❁❁❁

پہلے تو ہمیں مارا گیا دشت میں لا کر
اور بعد میں اِک خلق عزا دار ہوئی ہے

بقول ڈاکٹر ضیاءالحسن:

''اشرف نقوی نے Paradox/قولِ محال اور اگر روایتی زبان میں بات کی جائے تو صنعتِ تضاد سے اِتنا کام لیا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی تخلیقی منطق ہی اس صنعت سے ماخوذ ہے۔ ویسے تو پوری کائنات کا وجودی اصول یہی ہے۔ خیر شر، نیکی بدی، دن رات، جھوٹ سچ سے لے کر ایٹم کے منفی اور مثبت چارج تک کائنات اِسی تضاد سے وجود پذیر ہوئی ہے۔''

اچھی شاعری کی ایک سچی تعریف یہ ہے کہ وہ انسانی تجربوں یا مشاہدوں کی عکاس ہو۔ شاعری ہی کیا ادب کی بُنیاد ہی انسانی تجربوں کے بیان سے عبارت ہے لیکن تجربوں کے بیان کا معاملہ اِتنا آسان نہیں جتنا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی عہد یا ایک ہی روایت

کے دوشاعروں کے اجتماعی تجربے معرضِ اظہار میں آ کر مختلف معلوم ہوتے ہیں۔ مثال کے لیے عشق کو لیا جا سکتا ہے۔

سولھویں صدی سے لے کرتا حال اُردو کا شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس نے اِس موضوع پر شعر نہ کہا ہو۔ میرؔ سے قبل کی شعری روایت اگر منہا بھی کر دی جائے تو میر تقی میرؔ سے سلیم احمد تک ایسے متعدد اشعار ضرور تلاش کیے جا سکتے ہیں جو عشقیہ تجربے کے حامل ہوں گے لیکن یہاں فی الحال تین شعروں کی مثال مضمون کے مقدمے کے لیے لازم معلوم ہوتی ہے۔

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
(میر تقی میرؔ)

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مِرا کام
مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مِرے آگے
(غالب)

میں تم یہ رات ہائے کوئی جاوداں نہیں
جلدی سلیم پیار کرو ، لفظ مت گنواؤ
(سلیم احمد)

میر تقی میرؔ کے شعر میں عشق اور عشقیہ کیفیت ارتفاع کو چھوتی نظر آتی ہے۔ آنسو کی ضبطی معشوق کی تمام اِنسلاکاتی صفات (مثلاً ستم شعاری، کج ادائی، بے رُخی، ہرجائی پن) اور تمام صورتِ حال (مثلاً ہجر و فراق، نقل مکانی، عدم تعلق، تجاہلِ عارفانہ) وغیرہ کو بیان بھی کرتی ہے اور عاشق کی تہذیب کو نمایاں بھی۔ وہ تہذیب جو عشق کے فیضان سے پیدا ہوتی ہے۔ یہاں عاشق کا گِریہ زار نہ ہونا معشوق کو اُسی منصب پر فائز کرنا ہے جس پر وہ ہمیشہ فائز رہا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر عاشق اشک

بار ہوجاتا تو اُس کی اشک باری کے اسباب میں ایک یا شاید سب سے بڑا سبب معشوق سے اُس کا تعلق یا عدم تعلق ثابت ہوتا۔ نتیجے میں معشوق نمایاں ہوتا اور اُس کی رسوائی لازم ٹھہرتی، جو عاشق کو کبھی منظور نہ ہوتی۔

غالبؔ کے شعر میں عشق کے افسانوی دائرۂ اعتبار کو توڑنے کا رویہ نمایاں ہے اور اِس شدت سے نمایاں ہے کہ شعر کے پڑھنے اور سُننے والے دشتِ تحیّرات میں گم ہو جاتے ہیں۔ ''لیلیٰ مجنوں''، عشقِ صادق کی مشہور تلمیح ہے۔ یہ دونوں شخصیتیں عرصۂ دراز سے عشقِ مجازی کا آدرش بنی ہوئی ہیں۔ لیلیٰ کی وفاداری، مجنوں کے تئیں اُس کی خودسپردگی، مجنوں کا اُسے دیوانہ وار چاہنا، یہ ساری باتیں اِتنی بار دہرائی گئیں کہ خواب و حقیقت کا فرق مٹ گیا۔ غالب کم سے کم اُردو کی حد میں پہلے شاعر ہیں جنھوں نے خواب و حقیقت کے درمیان خطِ تفریق کھینچا۔ لیلیٰ کا مجنوں کو بُرا کہنا معشوق فریبی کے دعوے کی وہ دلالت ہے جو عاشق کے ایک بالکل نئے اور انوکھے کردار کو ظاہر کرتی ہے۔ اِس طرح میر تقی میرؔ کا مہذب عاشق ایک متعینہ زمانی فاصلہ طے کر کے مرزا غالب کے یہاں پہنچ کر ایک ذی ہوش قسم کا آدمی بن جاتا ہے۔ مرزا غالب کی یہی ہوش مندی میر کی دل سوزی کی تلافی ثابت ہوتی ہے۔

میر تقی میرؔ کا محبوب اپنی تمام تر ستم شعاری کے باوجود اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اُس کا عاشق کبھی گریہ زار نہ ہوگا کیونکہ اُسے اُس کی رُسوائی منظور نہیں۔ برعکس اِس کے غالبؔ عشق کے متعینہ دال (لیلیٰ مجنوں، عاشق معشوق) کو اپنی ذہانت سے اِتنا متاثر بلکہ گمراہ کرتے ہیں کہ پورا مدلّلی نظام ہی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ لیلیٰ کا گمراہ ہونا یعنی مجنوں کو بُرا کہنا صرف سخت روایتی قسم کے عشق کو ہی معرضِ سوال میں نہیں لاتا بلکہ عاشقِ ثانی (غالب) کی ذاتی برتری کو بھی نمایاں کرتا ہے۔

ذرا سلیم احمد کے شعر پر غور کیا جائے تو عشق کے تجربے کا پورا سیاق و سباق ہی بدلا بدلا سا نظر آتا ہے۔ سلیم احمد کے یہاں عشق کا وہ تجربہ بیان ہوا ہے جس کی تحریک نصف صدی کے صارفی نظامِ معاشرت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہاں عشق کی جو بھی نوعیت ہو اُس پر کوئی سوال قائم نہیں کیا

جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے اسفل و افضل کے خانوں میں منقسم۔ کہنا صرف یہ ہے کہ سلیم احمد کے شعر کا عاشق نہ تو میر تقی میرؔ کے عاشق کی طرح حد درجہ مہذب ہے اور نہ ہی غالب کے عاشق کی طرح ہوش مند بلکہ وہ میکانکی قسم کا ایک آدمی ہے جس کی ظاہری اور باطنی شخصیتوں کے درمیان کوئی حدِ فاصل موجود نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ جو محسوس کرتا ہے، معشوق سے اُس کا برملا اظہار بھی کرتا ہے۔ اُسے وقت کی قوت کا اندازہ ہے۔ اِس لیے وہ وجود (ذات) اور شے (رات) کی ناپائیداری کو ایقان کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ آئندہ اُس کے لیے مہمل اور موجود بامعنی ہے۔ لفظ کو نہ گنوانا معشوق کی بے جا تعریف سے اجتناب برتنا بھی ہے اور لفظوں کی مادی قدر و قیمت کو ظاہر کرنا بھی۔ صحافت کی دُنیا میں الفاظ فروش کا محاورہ لفظوں کی اِسی مادی قدر و قیمت کا غماز ہے۔ اِن مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک ہی تجربہ مختلف شعراء کے یہاں تشکیل و تجسیم کے مختلف مراحل طے کرتا ہے، اِس لیے وہ تجربہ اپنی معنوی خوبیوں میں ایک دوسرے سے خاصا مختلف واقع ہوا ہے۔ مذکورہ اشعار میں تجربہ ایک ہے لیکن اس کی معنویت ایک دوسرے سے خاصی مختلف ہے۔ معنویت کی یہ تفریق شاعر کے انفرادی شعور اور اجتہادی تخیّل سے قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا ایک شاعر کی فنی ہُنر مندی اور اسلوبی شناخت کی بحث اسی نکتے سے سروکار رکھتی ہے۔ تاہم یہی نکتہ تخلیقی عمل کی بنیاد ہے جو سائنسی اور غیر ادبی بیانیوں کو نصیب نہیں۔ شہر یار کی شاعری تخلیقی عمل کے اِسی بُنیادی نُکتے سے عبارت ہے، اِس لیے لازم ہے کہ اُن کی شاعری اسی نکتے کے حوالے سے پڑھی جائے۔

اشرف نقوی کے ناقابلِ شمار اشعار اپنے شعری کمال سے وجود حاصل کرتے ہیں۔

خاموشی سے کلام کیا اور چپ رہا
میں نے سخن مُدام کیا اور چپ رہا

❁❁❁❁❁

کہیں اپنے اُجالوں کو نہ کھا لے
اندھیروں سے لپٹتی روشنی بھی

❁❁❁❁❁

ہجرت و ہجر کی فراوانی
زندہ رکھتی نہ مارتی ہے مجھے

❁❁❁❁❁

دِن گزارا ہے ایک ہی پل میں
شب صدی کی طرح بِتانی ہے

❁❁❁❁❁

خوشی کو چھوڑ کے آزار کی طرف آیا
میں ایک دشت سے گھر بار کی طرف آیا

بڑی بحر ایک دریا کی مانند ہوتی ہے۔طغیانی میں ہوتو ہر چیز خس وخاشاک کی طرح بہا لے جائے۔موج میں ہوتو لہریں گنتے جاؤ اور ختم نہ ہوں اور اگر کہیں روانی میں کمی آ جائے تو جگہ جگہ جوہڑ بن جاتے ہیں۔اِس کے مقابلے میں چھوٹی بحر ایک گُنگناتی، لہراتی،بل کھاتی،مچلتی ندی کی طرح ہے اور جیسے دیوہیکل پہاڑ کی اوٹ سے جھرنا ایک دم آنکھوں کے سامنے خوش نما منظر لیے آجات ہے اسی طرح چھوٹی بحروں میں کہی ہوئی بات دھم سے آنکھوں کو چکا چوند کر دیتی ہے اور دماغ بغیر سوچ بچار میں پڑے فوراًروشن ہوجاتا ہے۔

چھوٹی بحروں میں شاعری کرنا ہر شاعر کا مشغلہ رہا ہے۔اساتذہ سے لے کر موجودہ عصر تک ہر شاعر نے ان بحروں میں طبع آزمائی کی ہے اور اصنافِ سخن میں سے غزل کو اِس میں خاص

امتیاز حاصل ہے۔تھوڑے اور گنے چنے الفاظ میں غزل کی رنگینیٔ بیاں کو نبھاتے ہوئے دو مصرعوں میں بات مکمل کر دینا بلکہ سامع تک پوری بلاغت سے پہنچا دینا واقعتاً ایک معانی رکھتا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ چھوٹی بحروں میں کہی ہوئی اچھی غزلیں اُردو ادب میں سدا بہار کا مقام رکھتی ہیں اور ان غزلوں کے اشعار اور مصرعے ضرب المثل کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔

اِن ہی چھوٹی بحروں میں ایک بحر، بحرِ خفیف ہے، بحرِ خفیف ایک مسدّس (تین ارکان والی) بحر ہے اور تقریباً تمام مسدّس بحریں چھوٹی ہیں کہ ان میں مثمن (چار ارکان والی) بحروں کے مقابلے میں ایک رکن کم ہوتا ہے اور پھر زحافات کا استعمال انھیں مزید مختصر کیے ہی چلا جاتا ہے۔ بحرِ خفیف کی ایک مزاحف شکل، بحرِ خفیف مسدس مخبون مخذوف مقطوع کا تعارف اور اس مخصوص بحر میں کہی ہوئی مشہور غزلیات کی ایک فہرست اس مضمون کا مقصود ہے۔

اشرف نقوی کے شعری آہنگ کی بات کی جائے تو اُنھوں نے تقریباً پچاس فیصد غزلیں چھوٹی بحر میں کہی ہیں۔طویل بحر میں ایک غزل بھی نہیں ہے۔اُن کے اس مجموعے (زادِ حرف) میں متعدد مقامات پر میرؔ سے عقیدت ومحبت کا اظہار بھی ہوا ہے لیکن اُنھوں نے مختصر بحور کے تجربے کو ہی زیادہ اختیار کیا ہے۔ یہ محض میر پسندی نہیں ہے کیوں کہ اوزان و بحور و آہنگ کسی بھی شاعر کے اسلوب کا سب سے پیچیدہ انتخاب ہوتا ہے جس میں شاعر کے تخلیقی مزاج، اُس کے موضوعات اور شعری فضا کو بھی دخل حاصل ہوتا ہے۔ عام طور پر چھوٹی بحریں کیفیاتی شاعری کے لیے زیادہ موزوں سمجھی جاتی ہیں۔ ہماری عشقیہ مثنویوں کی بحور بھی عموماً مختصر ہی ہوتی تھیں۔شاید یہ اِس لیے بھی ہو کہ اشرف نقوی کی شاعری کا مرکزہ عشق ہے اور اِس حوالے سے انھوں نے زندگی کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔

''آخرش'' جو کہ اشرف نقوی کا پہلا مجموعہ ہے اس کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اشرف نقوی کی شاعری ایک جدید طرزِ احساس اور فہم وِادراک کی شاعری ہے۔اشرف نقوی نے تخلیق کاری

کےفن اور حرف وصوت کے اعجاز سے مضمون آفرینی کے نہایت بلیغ، نہایت خوب صورت اور نہایت لطیف پیکر تراشے ہیں۔نقوی صاحب نے غزل کی جدید اور قدیم روایت کو ہم قدم کرتے ہوئے ایک نیا اسلوب اور ایک نیا آہنگ دریافت کیا ہے جو اُن کے فن کی شناخت کی حیثیت رکھتا ہے۔
بقول خواجہ محمد ذکریا:

''شاعری میں اپنی شناخت بنانے کے لیے بہت عرصہ درکار ہوتا ہے۔ یہ دس پندرہ سال نہیں بلکہ تیس چالیس سال کی بات ہوتی ہے۔تیس چالیس سال مسلسل لکھنا اور اچھا لکھنا پھر کہیں جا کر آپ کی شناخت بنتی ہے۔''

اشرف نقوی نے الفاظ کی مصوّری کو پینٹ کرتے ہوئے زبان وادب کو ایک نئے زاویے اور جداگانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ وہ نفی اور اثبات کے فرسودہ اصولوں سے گریز کرتے ہوئے زندگی کے متحرک اور جاوداں منظر نامے کو اپنے مشاہدے اور تجربے کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔جس کی بِنا پر آپ کی فنی ریاضت میں نئے خیالوں کی دریافت کو تجربے اور دھیان گیان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

اشرف نقوی کی شاعری میں تازگی، ندرت اور تجریدِ شعر کا احساس نمایاں ہے جو آپ کے نظریاتی اور فکری مزاج کو آشکار کرتا ہے۔ ان کے ہاں عہدِ نو اپنی تمام تر رعنائیوں اور توانائیوں کے ساتھ منعکس ہوتا دِکھائی دیتا ہے یعنی اُنھوں نے روایت سے جدت کی طرف سفر کیا ہے۔آپ کی غزل تخلیقی تجربے، مشاہدے اور مجاہدے کے ساتھ ہم قدم ہوتی انفرادیت کے تیور رکھتی ہے۔

شاعری میں احساس کو مختلف سطحوں پر برتا گیا ہے۔تخلیقی زبان کی بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ اِس میں لفظ اپنے لغوی معنی سے کہیں آگے نکل جاتا ہے اور معنی ومفہوم کی ایک ایسی دُنیا آباد کرتا ہے جسے صرف حواس کی سطح پر دریافت کیا جا سکتا ہے۔ یہ احساس خود تخلیق کار کا بھی ہے اور اس کے قاری کا بھی۔ان شعروں میں دیکھیے کہ ایک شاعر اپنی حِسّی قوت کی بُنیاد پر زندگی کے کن نامعلوم گوشوں اور کیفیتوں کو زبان دیتا ہے۔

اشرف نقوی کی کتاب کے مطالعہ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ آپ نے محض دوسرے ہم عصر شعراء کی دیکھا دیکھی محض فیشن کے طور پر ہی جدیدیت کو نہیں اپنایا بلکہ اپنے فن کو مقصدیت کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ جدیدیت سے کیا مراد ہے؟ اِس سوال کے جواب کے لیے ہمیں نئے عہد کے اُن اساسی عناصر کا جائزہ لینا ہوگا جو اس کے تشکیلی عناصر کہلائے جا سکتے ہیں۔ ادبی حیثیت اپنی مخصوص خصوصیات کی بنا پر ایک واضح انفرادی حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔

ہر دور میں ادیبوں اور شاعروں نے اپنے عہد کے حالات کے شعور کو اپنی تخلیقات میں ظاہر کیا ہے۔ مثلاً اُنیسویں صدی میں ہنگامۂ غدر کے بعد ہندوستان میں مغربی اقتدار کے مستحکم ہونے کے نتیجے میں نئے حالات کے شعور کا اِظہار آزادؔ، حالیؔ اور سرسیّدؔ کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اِسی طرح بیسویں صدی کے آغاز میں یورپی اثرات کے زیرِ اثر پرانی اور نئی قدروں کی کرب انگیز کشمکش کا اِظہار اقبالؒ کے یہاں موجود ہے لیکن جب ہم عہدِ جدیدیت کے شعور اور اس کے مختلف تخلیقی اِظہارات کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی خصوصیات نہ صرف اس کی انفرادیت کو واضح کرتی ہیں بلکہ ما قبل کے ادوار کے شعور سے فرق کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔

جدید عہد سائنسی عقلیت کا عہد ہے۔ سائنسی عقلیت زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک ایسے رویے کی غماز ہے جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ انسان کے مزاج، رویے اور شعور میں گہری تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ جدید انسان جو نئی نسلوں کا نمائندہ ہے ذہنی اور جذباتی طور پر اِتنا مختلف غیر روایتی اور جدید ہوگیا ہے کہ پرانی نسلوں سے بالکل مختلف ہوگیا ہے۔

جدیدیت کی مختصر ترین تعریف یہ ہوسکتی ہے کہ یہ اپنے عہد کی زندگی کا سامنا کرنے اور اسے تمام خطرات و امکانات کے ساتھ برتنے کا نام ہے۔ جدیدیت ایک ایسا مستقل عمل ہے جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ہر عہد میں ان لوگوں نے جو حقیقی طور پر زندہ رہے ہیں، اس عمل میں حصہ لیا ہے۔ اُنھوں نے فکر و فن کی سطح پر فرسودہ اقدار کے خلاف جنگ کر کے نئی قدروں کی پرورش کی اور عملی زندگی

کو نئے سانچوں میں ڈھالا ہے۔

اشرف نقوی نے شعر گوئی کی اصل روح کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شاعرانہ حقیقت سے اپنے تخلیقی وجود کو اپنے ساتھ ہم آہنگ رکھا ہے۔ یوں آپ کا آہنگ اور آپ کا لب و لہجہ انسانی زندگی کا مزاج آشنا ہوتا دِکھائی دیتا ہے۔ یہاں میں اشرف نقوی کا یہ شعر ضرور سنانا چاہوں گی:

سنا رہا ہے کہانی یہی ، غبار مِرا
مِلا ہوا ہے کسی دشت سے دیار مِرا

امجد اسلام امجد نے اشرف نقوی کے مجموعے (آخرش) کے بارے میں اپنے خیالات کا اِظہار اِس طرح سے کیا ہے:

''غزل شاید اُردو ادب کی واحد صنفِ سخن ہے جو جس قدر خوب صورت ہے اس سے زیادہ خوش بخت ہے کہ گزشتہ تین سو برس میں شاید ہی کوئی ایسا زمانہ ہو جب اِس میں تازہ اور صحت مند خون کی آمد کا تسلسل ٹوٹا ہو۔ اس کی ایک زندہ مثال اشرف نقوی کا یہ مجموعۂ کلام ہے جس کی غزلوں سے قطعاً یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کسی ''تازہ وارد'' کا کلام ہے۔ موضوعات کا انتخاب، فکری تازگی، فنّی گرفت، اظہار کی قوت اور بے ساختگی اور ردیفوں کا ماہرانہ استعمال ایسا ہے کہ قاری اسے پڑھ کر چونکتا بھی ہے اور ایک ایسی جذباتی آسودگی محسوس کرتا ہے جو کسی بھی اچھے فن پارے کے اندر خون کی طرح گردش کرتی رہتی ہے۔''

اشرف نقوی غزل کی جملہ لطافتوں اور نزاکتوں کا مکمل شعور رکھتے ہیں۔ وہ ان کو اپنے سخن میں اِس درجہ خوب صورتی اور ہُنر مندی کے ساتھ استعمال میں لاتے ہیں کہ آپ کی غزل پوری دل کشی اور رعنائی کے ساتھ تجسیم ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

وصل کی شام شبِ ہجر میں تحلیل ہوئی
تب کہیں جا کے مِرے عشق کی تکمیل ہوئی

نیند کے چاک پہ رکھا مجھے کوزہ گر نے
عالمِ خواب میں گویا مِری تشکیل ہوئی

غزل اُردو شاعری کی مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔ غزل توازن میں لکھی جاتی ہے اور یہ ہم قافیہ اور ہم ردیف مصرعوں سے بنے اشعار کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مطلع کے علاوہ غزل کے باقی تمام اشعار کے مصرعۂ اُولیٰ میں قافیہ اور ردیف کی قید نہیں ہوتی ہے جب کہ مصرعِ ثانی میں غزل کا ہم قافیہ و ہم ردیف کا استعمال کرنا لازمی ہے۔ غزل کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم بحر اور ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ غزل کا آخری شعر مقطع کہلاتا ہے بشرطیکہ اس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرے ورنہ وہ بھی شعر ہی کہلاتا ہے۔

عہدِ حاضر کی غزل ایک طویل مدت تک مشاہدے، تجربے اور محسوسات کی گنجان اور کٹھن راہ پر سفر کرتی ہوئی اشرف نقوی تک پہنچی ہے۔ جس کے ساتھ اشرف نقوی کا برتاؤ فقید المثال ہے۔ ان کی شاعری میں یہ خوبی بہت نمایاں ہے کہ آپ نے غزل کی مخصوص روایت سے بھی انحراف نہیں کیا اور جدت وندرت کے ساتھ رِشتہ بھی استوار رکھا ہے۔ یوں اشرف نقوی کی غزل روایت اور جدت کی نہایت دل کش و دل آویز تصویر پیش کرتی ہے۔ ملاحظہ کریں:

زمانہ ساز تھے دونوں کہ رسمِ دُنیا کا
خیال اُس نے بھی رکھا ، خیال میں نے بھی

❁❁❁❁❁

یہ ہجر ہی تو ہے تیرے وصال کا حاصل
اِسی چراغ کو جلنا ہے عمر بھر مجھ میں

اشرف نقوی کی غزل میں احساسات کی صورت گری اور جذبات کی مرقع نگاری اسی قرینے اور قاعدے کے ساتھ معرضِ وجود میں آتی ہے کہ دل ونگاہ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوجاتی

ہے اور قاری کے تخیل میں حرف و معانی کے نئے نئے جہاں آباد ہونے لگتے ہیں۔

تمھارے ہجر میں ہجرت کو بوجھ اُٹھائے ہوئے
کہاں کہاں سے مِری خاکِ پا نہیں گزری

❁❁❁

خاموشی کی دستک سُن
دیواروں سے کان لگا

❁❁❁

تمام دشت و دمن میرے آگے آگے چلے
اور ان کے پیچھے مِرا قافلہ روانہ ہوا

❁❁❁

جیسا تشنہ لبی سے حال مِرا
ویسا دریا کا حال ہے سائیں!

ستارہ و افلاک انسان کے بیچوں بیچ کا طویل فاصلہ ایک ایسی فکری جہت کا متقاضی ہے جو بھرپور ہو، برمحل ہو اور یہ جہت ہمیں اشرف نقوی کے ہاں نظر آتی ہے۔ اِسی لیے اس کی شاعری ہمارے عمومی اسلوب کے معیارات پر پورا اُترتے ہوئے ایک نیا آہنگ تشکیل دے رہی ہے۔ اس کا لہجہ اپنے ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔

اُردو زبان و ادب کی دُنیا میں میر تقی میرؔ ایک چمکتا ہوا ستارہ ہیں، اُن کی اُستادی کا اعتراف غالب، ناسخ، اور ذوق جیسے قادرالکلام شعراء نے کیا۔ اس سے میرؔ کی شاعرانہ حیثیت اور اُن کی ادبی اوّلیت مسلّم ہوتی ہے کیوں کہ اُنھوں نے اُردو غزل کو نیا رنگ و آہنگ اور منفرد لب و لہجہ عطا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ شعرائے متأخرین نے اُنھیں خدائے سخن کے لقب سے ملقّب کیا اور مرزا غالب جیسی غزل

کی دُنیا کا جادوگر یہ کہنے پر مجبور ہوگیا:

ریختے کے تُمھیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

ہر شاعر اپنے سماج اور ماحول کا پھل ہوتا ہے، اس کے سامنے وقوع پذیر ہونے والے واقعات و حادثات، اس کی ذاتی زندگی میں رونما ہونے والے تجربات اور اس کے متعلق اُس کے تاثرات ہی حقیقت میں اس کے ادبی ذوق وشوق کی تربیت کرنے اور اُس کی شاعری کو جِلا بخشنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ سماج اور معاشرے کی الٹ پھیر کے ساتھ ساتھ لاشعوری طور پر شاعر اپنے افکار ونظریات کو مختلف رنگ میں رنگ کر ایک خوب صورت غزل تیار کرتا ہے اور اِس طرح اُس کی شاعری وقت کی رفتار کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

میر تقی میرؔ کا وجود اِس دُنیا میں ایک ایسے زمانے کے اندر ہوا جو سیاسی، سماجی، ملکی اور معاشی اعتبار سے سخت انتشار اور افراتفری کا دور تھا۔ مغل حکومت دن بہ دن کمزور ہو رہی تھی۔ جو شخص بھی اپنی ذاتی قابلیت اور ریشہ دوانیوں سے یا اپنے حلیفوں کی مدد سے وزارتِ اعلیٰ کے منصب پر فائز ہو جاتا دراصل وہی حکمرانِ وقت ہوتا۔ ہندوستان کے ڈھیر سارے صوبے خودمختار ہو چکے تھے۔ پورا ملک لُوٹ مار کا شکار تھا۔ میرؔ نے قیامِ دِلّی کے زمانہ میں لُوٹ مار اور قتل وخون کے ایسے بے شمار مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنی ذات پر سہے۔ لُٹے پٹے شہروں، کاروانوں اور انسانوں کے ان مناظر نے میر کی شاعری میں ایک المیہ رنگ پیدا کر دیا۔ اِس رنگ کا غلبہ اِتنا شدید تھا کہ بعد ازاں وہ علم سے محبت کرتا ہوا نظر آنے لگا۔

میر تقی میرؔ کی شاعری میں ایک سوگ وار ماتمی لَے مستقل طور پر سنائی دینے لگی۔ دِلّی کی بربادی، عزیزوں اور خاندانوں کی تباہی، آئے دن کے انقلاب، مرہٹوں، جاٹوں اور دُرّانیوں کی قتل و غارت گری میرؔ نے اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ میر کی شاعری میں خون کے یہ دھبے آج تک

نمایاں ہیں۔

دِلّی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی ، تصویر نظر آئی

❁❁❁

دِلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں اُسے
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

مِیر زندگی کے نہایت بھرپور تجربہ کا شاعر تھا، ایک ایسا شاعر کہ جس نے اپنے عہد کے کربناک مناظر دیکھے۔ وہ ہمارے تہذیبی اور تاریخی حافظے کا شاہد تھا۔ اُس نے تاریخ کو نہایت تیزی سے ٹوٹتے اور بکھرتے دیکھا۔ اِس عذاب کو اُس نے اپنی ہڈیوں پر سہا۔ وہ تہذیبی زوال اور آشوب کا مؤرخ بھی تھا اور نوحہ خواں بھی۔ اُس کے اشعار پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ اُس کا ہر ایک شعر ایک آنسو ہے اور ہر مصرع خون کی ایک بوند ہے۔

زندگی کے بارے میں میر تقی میرؔ کا نقطۂ نظر حزنیہ تھا۔ حزن ایک ایسے درد والم سے عبارت ہے جو اپنے اندر تفکر اور تخلیقی صلاحیتیں بھی رکھتا ہے۔ میرؔ کا تصوّرِ زندگی مایوس کُن نہیں۔ صرف اس میں حزن و ملال کا وجود بہت زیادہ ہے مگر یہ حزن و ملال ہمیں زندگی سے نفرت و عداوت کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ میرؔ کا کمالِ فن یہی ہے کہ اس نے کانٹوں پر زندگی بسر کرنے کے بعد بھی زندگی کی بھرپور توانائی کا احساس دلایا۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میرؔ کا تصوّرِ غم تخلیقی اور فکری ہے۔ یہ قنوطیت پیدا نہیں کرتا اِس کے ہوتے ہوئے میرؔ کی شاعری میں توازن اور ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔ شکستگی کا احساس نہیں ہوتا اور ضبط، سنجیدگی اور تحمّل ملتا ہے۔

وہ حزن واَلم سے دوچار ہونے کے باوجود بھی اسے فرحت ونشاط بنا دیتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری کو پڑھنے کے بعد ہمارے احساسات وجذبات اور افکار ونظریات میں وہ برداشت اور سنجیدگی پیدا ہوتی ہے جس کو صحیح معنوں میں تحمّل کہا جاتا ہے۔

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خوں نابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

میرؔ کی شاعری میں دردمندی، حزن واَلم کا دوسرا نام ہے۔ دردمندی سے مراد زندگی کو درپیش آنے والی تلخ حقیقتوں کا اعتراف واِدراک اور حتی المقدور اِن تلخیوں کو دُور کرنے کی سعی وکوشش کا نام ہے۔ دردمندی اُن کی حیاتِ مبارکہ کے تضادات سے جنم لیتی ہے۔ دردمندی کا منبع ومصدر قلب ہے۔ میرؔ کہتے ہیں:

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
دردمندی میں گئی ساری جوانی اس کی

❁❁❁

نہ درد مندی سے تم یہ راہ چلے ورنہ
قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد

اشرف نقوی نے میرؔ صاحب کے شعری استعارے کے حصول میں غالب کی بات کو بھی ذہن میں رکھا اور ساتھ میں ابراہیم ذوق کی بات سے بھی صرفِ نظر نہ کیا۔ حسرت کے کہنے پر میر کا شیوۂ گرفتار سمجھنے کی کوشش کی۔ میرؔ کے مقلد ہونے پر مخدوم کی بات کو گِرہ میں باندھا۔ ظریف احسن کا مشورہ کہ ''شاعری میں سوز چاہیے تو روز وشب میرؔ صاحب کی صحبت میں رہو'' پر عمل پیرا رہتے ہوئے

کتاب کے عنوان کے معانی کو نت نئے مفہوم دیے۔

اشرف نقوی نے میرؔ صاحب کے کہے کو اپنے عمل سے کتاب کی صورت ''زادِ حرف'' میں سچ کر دِکھایا۔

میں کتابِ زیست کا عُنوان ہوں
کیوں نہ ہوں میرے معانی مختلف

اشرف نقوی کے سفر کا پہلا پڑاؤ تو ''آخرش'' جو دو دَہائیوں پر محیط........ دوسرا پڑاؤ ''زادِ حرف'' کا دورانیہ ایک دَہائی بھی تیس دَہائیوں کی مسافت میں خود کو تلاش کرنے کا عمل، اِس دریافت کے عمل میں شب بیداریاں، حرف کی حُرمت کی پاسداریاں، یہ کرمِ خاص سچی لگن سے مشروط اور عجز کی انتہا یہ کہ خود کو تہی داماں کہنا، باوصف ہونے کے باوجود خود کو بے ہنر کہنا ہی درحقیقت ہر سُو ہنر ہی کا کمال ہے۔ اِسی تناظر میں اشرف نقوی کے کچھ شعر دیکھتے ہیں:

خود کو تو اب تلک بھی میسر نہیں ہوئے
تجھ کو زمانے ! ہوں گے کہاں دستیاب ہم

❁❁❁

مگن ہوں گرچہ خود کو جاننے میں
نہیں مجھ پر کھلے اسرار میرے

❁❁❁

ہم یوں ہی رات کو تو نہیں جاگتے میاں!
ہم اہلِ حرف کی یہ کمائی کا وقت ہے

کسی بھی معاشرے میں تخلیقی عمل اور جدت پسندی کا انحصار انفرادیوں آزادیوں، صحت مند مقابلے، آزادیِ اِظہار کے تنوع اور باہمی برداشت کی وسعت پر ہوتا ہے۔ پاکستان میں اِنھی

عوامل کی کمیابی کے باعث جدت پسندی کا فقدان پایا جاتا ہے۔آج اِکیس اپریل بروز ہفتہ اقوامِ متحدہ کی طرف سے دُنیا بھر میں تخلیقی سوچ اور جدت پسندی کی حوصلہ افزائی کے عالمی دن کے طور پر منایا جا رہا ہے، جس کا مقصد عمومی معاشرتی جدت اور ترقی کے لیے مختلف اور نئی سوچوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے کیونکہ نئے امکانات نئے راستوں پر چلنے سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔

ہر فنکار کے اندر اس کی تخلیق کی ہوئی ایک نہایت ذاتی دُنیا آباد ہوتی ہے جس کا وہ بلا شرکتِ غیرے مالک ہوتا ہے۔اس دُنیا کی تعمیر میں وہ وقت اور خلا کی قید سے آزاد ہوکر مصروفِ عمل رہتا ہے۔یہ دُنیا اُس وقت تعمیر کے آخری مراحل کو پہنچتی ہے جب اس کا عکس فن کار کے اظہار میں نظر آنا شروع ہوجائے۔

یہ اظہار کا وہ مقام ہے جب اسے کسی بیرونی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔وہ اپنی داخلی کیفیت کو ایسے پیرائے میں بیان کرتا ہے کہ ایک غیر مرئی طریقے سے بیرونی کیفیات پر غالب آ کر اپنی ذاتی دُنیا کی جھلک دکھا سکے۔ بظاہر یہ ایک پیچیدہ عمل ہے مگر اشرف نقوی کی غزل نے اِس قالب کو ایسے ہنرمندی کے ساتھ کھولا ہے کہ ہر کسی کو اس پر اسی کیفیت کا گماں ہوتا ہے اور یہی اس کے فن کا کمال ہے۔

اِس ضمن میں اُن کی غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

آئینہ عکس پہ حیران کہاں تھا پہلے
میرے جیسا کوئی انسان کہاں تھا پہلے

یہ تو اب آ کے تجھے جانا ہے میں نے ، ورنہ
تیرے ہونے کا بھی امکان کہاں تھا پہلے

دُکھ ہے اِس کو بھی مِرے جیسا ہی شاید کوئی
دشت میری طرح ویران کہاں تھا پہلے

ہجر ہی نے تو مجھے وصل کی آسانی دی
قرب ورنہ ترا آسان کہاں تھا پہلے

اشرف نقوی کا تعلق نئی غزل کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان زبان واظہار کے سلسلے میں جو آزادیاں برتی گئیں وہ بعد کو بالکل ختم نہیں ہوئیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شعراء جو غزل کی زبان کو روایت سے ہٹا کر بالکل جدید بنانا چاہتے تھے، وہ کسی نہ کسی حد تک اپنی رَوِش پر قائم رہے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد کے شعروادب کو مابعد جدیدیت کا نام دیا جاتا ہے اور دلیل یہ پیش کی جاتی ہے کہ فکری اور لسانی سطح پر ۱۹۸۰ء کے بعد ایک گریز کا عمل دکھائی دیتا ہے۔ جدیدیت نے جس ابہام اور ابتذال کو بڑھاوا دیا اُس میں واضح کمی ہوئی اور یہاں سے شعروادب کا ایک نیا سفر شروع ہوتا ہے۔

اشرف نقوی نے بے شمار غزلیں لکھیں مگر اس کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے نظم، حمد، نعت اور سلام میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شخصیت ایک پورا دبستان ہے۔ ان کی شاعری میں سادگی کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ شعر ایسے کہ قاری کو پڑھتے ہی سمجھ میں آجائیں۔

لغوی اعتبار سے حمد وہ نظم پارہ یا شعری مرقع ہوتا ہے جس میں خالقِ کائنات کی تعریف کی جائے۔ میرے خیال میں حمد یہ شاعری وہ شعری کاوش ہے جس میں تعلق مع اللہ یا تعلق باِللہ ظاہر ہو اور ربِّ کائنات کو اُس کے ذاتی یا صفاتی ناموں سے اِس طرح پکارا جائے کہ اُس کی عظمت وجلالت، رحمت ورافت اور محبوبیت کا اظہار ہوتا ہو اور کسی نہ کسی سطح پر بندے کا اپنے معبود سے تعلقِ خاطر ظاہر ہو۔

اللہ کی عظمت اُس کی مخلوقات کے حوالے سے بیان ہو، انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں اور اُس کی فتوحات کے توسط سے عظمتِ خالق کا تذکرہ آئے یا انسانی عجز وانکسار کا احساس اشعار میں ڈھل جائے۔ کائنات کی وسعتوں کے ذریعے تکبیرِ رب کا پہلو نکلتا ہو یا معرفتِ نفس کے راستے سے رب

تک پہنچنے کی خواہش کا شعری مرقع بنتا ہو۔ اللہ کی بڑائی کے تصور کے ساتھ آفاق (کائنات) سے مکالمہ ہو یا انفس (اپنی ذات) سے، یا براہِ راست ربّ العالمین سے۔ ہر قسم کی شعری آواز حمد کے ذیل میں آتی ہے۔

محبوبِ حقیقی کے تصور میں شعر گوئی کی ایک مضبوط روایت قائم تو ہوئی لیکن اس شاعری میں بیشتر بیانیہ لہجہ اور سادہ اسلوب ہی سامنے آسکا۔ فلسفیانہ خیالات کی پیچیدہ بیانی اور مابعد الطبیعاتی مسائل کی گہرائی غالب کے قلم کی محتاج تھی۔ غالب نے اُردو شاعری کو فکری بلندی اور فلسفیانہ عمق سے آشنا کیا اور وحدت الوجودی افکار کو شعری جمالیات سے اِس طرح ہم آہنگ کیا کہ اُن کی شاعری زمان و مکان کی حدود سے بہت آگے کی چیز بن گئی۔ غالب رَوِشِ عام پر چلنے والے شاعر نہ تھے۔ اِس لیے اُنھوں نے خاص اہتمام سے حمدیہ شاعری نہیں کی بلکہ اپنے دیوان کی اِبتداء ایسے شعر سے کی جو وحدت الوجود کی فکری گہرائی، اسلوب کی جدت اور امیجری کی ایک نادر مثال ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

غالب کی غزلوں میں تصوّف کا فکری نظام اُن کی تخلیقی دانش کا اِس طرح حصہ بن گیا تھا کہ اُنھوں نے جہاں محبوبِ حقیقی کی بات کی، خیال کی رفعت اور ندرت نے شاعری کو شعری لطافت کے ساتھ ساتھ صوفیانہ قلبی حرارت بھی عطا کر دی۔ غالب نے کہیں تو خالق کو اپنی ذات میں جھانک کر اور اپنے خالق کے توسط سے عرفان کی کوشش کی، کہیں شکوۂ نارسائی کیا اور کہیں اپنی حیرت کے احساس سے نگارخانۂ تخلیق کو حیرت کدہ بنا دیا۔ مثلاً:

کس کی برقِ شوخیٔ رفتار کا دلدادہ ہے
ذرّہ ذرّہ اِس جہاں کا اضطراب آمادہ ہے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگین تجھ سے

آئینہ داریِ یک دیدۂ حیران مجھ سے

غالب کے اِس شاعرانہ رویّے اور اسلوب نے اُردو شاعری کو اعتبار اور موضوعاتِ شاعری کو وقار عطا کیا۔ اِس طرح حمدیہ مضامین کے حوالے سے بھی غالب اُردو شاعری میں جدید رُجحانات اور نادر طرزِ احساس کا اوّلین شاعر قرار پایا۔ غالبؔ کے بعد اقبال کو اپنا پورا نظامِ تخلیق اُنھی خطوط پر استوار کرنے کی سعادت حاصل ہوئی جن کی وجہ سے شعری پردے پر محبوبِ حقیقی کے صفاتی نقوش اُبھر رہے تھے۔

اقبال کی فکری اساس مابعد الطبیعاتی تفکر پر تو تھی لیکن اُنھوں نے وحدت الوجودی فلسفۂ تصوّف کے برعکس ایک الگ نظامِ فکر کی بنیاد رکھی جس میں عبد و معبود کے اتحاد کا شائبہ تک نہ تھا۔ اُنھوں نے عبد کو الگ تشخص دیا اور خود کو (یا انسان کو) ایک پروانۂ ہوش مند بنا کر پیش کیا۔ جو وصل کو مرگِ آرزو سمجھ رہا تھا اور ہجر کی لذّتِ طلب کو ایک نعمتِ غیر مترقبہ جانتا تھا۔

اقبال کی شاعری میں فرد کی انائے جزوی انائے کُلّی میں کہیں مدغم نہیں ہوئی جبکہ انائے کلی کے قریب ہونے کی آرزو کو اُس نے مختلف جہتوں سے دیکھا اور اپنے داخلی احساسات کو فکری اصابت کے ساتھ تخلیقی تجربے کا جزو بنایا۔ اقبال کی شاعری عبد و معبود کے درمیان مکالمہ بھی ہے اور عشقِ حقیقی کی کیفیتوں کا اظہار بھی۔ اُس کی شاعری میں آفاق کی تسخیر کی فکری حرارت بھی ہے اور کائنات میں غور وخوض کے نتیجے میں حقیقتِ کُبریٰ تک رسائی کا اشاریہ بھی۔

اقبال کو اُس کے ہمہ وقتی مکالماتِ عبد و معبود جرأتِ رندانہ بھی عطا کی جس میں وہ نازِ عبودیت کے زیرِ اثر عبدِ بے باک نظر آتے ہیں۔ اِس رویّے نے اقبال کی پوری شاعری کو ایک نوع کی حمدیہ شاعری کا پیکر دے دیا کیونکہ اِس شاعری کے مطالعے سے تصورِ خالق ہی کے مختلف نوعی عکس ظاہر ہوتے ہیں۔

اقبال کی شاعری میں حمدیہ شاعری کی روح اِس طرح جاری و ساری ہے کہ اس میں حمد کے

تمام امکانات جلوہ ریز ہیں۔شکوہ جوابِ شکوہ تو بیانیہ قسم کی نظمیں ہیں لیکن ''جگنو'' اُن کی ایسی نظم ہے جس میں مظاہرِ قدرت کو بڑی فنکارانہ چابک دستی اور ہُنر مندی سے شعری جامہ پہنایا گیا ہے۔

اشرف نقوی نے بھی غالب اور اقبال کی پیروی میں حمدیہ شاعری پر طبع آزمائی کی۔ان کی حمد سے کچھ اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

رہنما تُو ہی ہر سفر میں ہے
منزلیں تیری ، کارواں تیرا
میری معراج ہے فقط اِس میں
ہو جبیں میری ، آستاں تیرا
تیری جانب سے خیر و شر کا وجود
ہر یقیں تیرا ، ہر گماں تیرا

نعتِ رسولِ مقبول کا وجود اور اس کی روایت ہر زبان و اَدب میں ہے۔ ہر مذہب کے پیروکاروں نے نعت گوئی کی ہے اور جس شاعر نے بھی وصفِ نبیؐ لکھا ہے، اُس کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھا اور اُسے شعری سرمائے کا قیمتی حصہ تصور کیا اور یہ امر بھی طے شدہ ہے کہ کوئی بھی بشر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مِدحت اور توصیف کا حق ادا نہیں کر سکتا باوجود اِس کے کہ نعت گو شعراء کی ایک طویل فہرست ہے۔ البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بعض کو اِس صنف سے شغف اور لگاؤ تھا تو اُنھوں نے تواتر اور اہتمام کے ساتھ اِس امر کو انجام دیا اور کسی نے محض تفننِ طبع کے لیے اِس میدان میں طبع آزمائی کی اور بعض وہ نامور شعراء بھی ہیں جنھوں نے خود کو اِس قابل نہیں جانا کہ وہ وصفِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کر سکیں۔ اِس طرح اُنھوں نے خود کو مشکل میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔

شعری اصناف میں نعت گوئی، ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محاسن و خصائص کا بیان کرنا اور پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات، اخلاق و کردار کو شعری جامہ پہنانا اور حضورؐ کی منظوم پیکر تراشی ایک

دُشوار اور مشکل کام ہے کیونکہ ہر شخص اور ہر شاعر کا اِس فن میں خود کو ثابت کرنا اور اِس موضوع سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہے۔ صنفِ نعت کی نزاکت اور اس کی مشکلات کا احساس اور اندازہ اُن شعراء کو ہے جنھوں نے نعت گوئی میں اس کے لوازمات اور متقضیات کو ملحوظ رکھا ہے اور جو نبیؐ کے مقام و مرتبہ اور دربارِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ادب و احترام سے بخوبی واقف ہیں، کیونکہ نعتیہ شاعری کا فن تلوار کی دھار پر چلنے جیسا ہے۔ اگر شاعر مدح سے بڑھا تو حمد میں پہنچ جاتا ہے اور تعریف و توصیف میں کمی کی تو تنقیصِ ممدوح لازم آتا ہے اور یہ دونوں عیب میں شمار کیے جاتے ہیں۔

اقبال کے شعری سرمائے میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت و سوانح، اخلاق و کردار اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خصائل و اوصاف سے متعلق ہیں البتہ نعتِ نبیؐ، مدحِ پیمبرؐ، یا نعتِ رسولِ مقبولؐ کے عنوان کے تحت کوئی بھی منظوم کلام اُن کے یہاں نہیں ملتا جیسا کہ دیگر رسمی نعت گو شعراء کے یہاں نعت کا عنوان دیکھنے کو ملتا ہے۔ اِس طرح اقبال رسمی معنوں میں نعت گو شعراء کی فہرست سے خارج ہو جاتے ہیں لیکن اُن کے متفرق منظوم کلام میں نعت کے موضوع پر اِتنے اشعار اور قطعات دستیاب ہو جاتے ہیں کہ نعت گو شعراء میں اُن کا شمار کیا جائے۔ اِس طرح اُردو نعتیہ شاعری کی تاریخ میں اُن کا ذکر کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

یہ امر مسلّم ہے کہ اُن کے یہاں نعتیہ اشعار بہت کم ہیں اور ایک بھی مکمل نعتیہ کلام نہیں ہے مگر جتنے بھی اشعار پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نعت سے متعلق ہیں اُن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فکری اور فنی اعتبار سے اعلیٰ و معیاری نعتیہ شاعری کے نمونہ ہیں اور وہ اشعار یہ باور کراتے ہیں کہ مشہور اور معروف نعت گو شعراء کے یہاں اِس طرح کی شاعری کا مزاج نہیں ہے اور نہ ہی اُن کی فکر و خیال کا پرندہ وہاں تک پرواز کر سکا ہے کیونکہ اقبال کے نعتیہ اشعار ذات و صفاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ساتھ دینِ مصطفیٰؐ کے اساسی پہلوؤں کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔

اقبال نے براہِ راست مدحتِ رسولؐ کرنے کی بجائے بالواسطہ اپنی نظموں میں چند اشعار یا

ایک دو ایسے اشعار کہے ہیں جو مدحِ رسولؐ، سیرت النبیؐ اور پیغامِ رسولؐ سے متعلق ہیں اور یہ تمام اشعار حقیقت و معرفت، توحید و رسالت، اسلام کے آفاقی پیغام، غافل مسلمانوں کو جھنجھوڑنے، اُنھیں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغام کا پاس و لحاظ رکھنے اور مسلمان ہونے کا احساس دلانے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وفا کرنے جیسے موضوعات پر مشتمل ہیں۔

''دہر میں اِسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے'' اِقبال کے یہاں تخلیقِ کائنات کی غرض و غایت ذاتِ مصطفویؐ ہے اور یہ غرض و غایت ''لولاکَ لماخلقتَ الدُّنیا'' سے کشید ہے۔ نیز سارا عالمِ اِمکان اِسی مرکز و محور کے گرد گردش کرتا ہے۔ اُنھوں نے اُردو نعت گوئی کو فکری و فنی طور پر وسعت دی، نعت کے موضوع کو قوم و ملک کی سیاسی و تمدنی زندگی سے ہم آہنگ کر کے اُسے ایک نیا رُوپ دیا اور ایک نئی شکل دی۔

نعت گوئی کے قدیم اسالیب اور معروف طریقۂ کار کو نظر انداز کر کے نظم کی جدید ہیئتوں اور اسالیب کو نعت کے موضوع کا متحمل بنایا اور نظم میں نعت کہنے کی نئی طرح ڈالی اور اُسے فروغ دیا اور اس کو اکثر ناقدوں نے سراہا اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اُن کے نعتیہ کلام میں نعتیہ عناصر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اُن کی پوری نعتیہ شاعری کا حقیقی محور سیرتِ محمدیؐ اور اُسوۂ رسولؐ ہے حتیٰ کہ اُن کے فلسفۂ خودی کا اصل الاصول بھی یہی ہے۔ ''اسرارِ خودی'' سے لے کر ''جاوید نامہ'' تک اُن کا کلام دیکھ لیجیے، اِس محور سے انحراف مشکل سے کہیں ملے گا۔ اُن کا کلام صاف بتاتا ہے کہ اُن کے فکر و فن کا نقطۂ آغاز بھی رسالت ہے اور نقطۂ اِرتقاء و اِتمام بھی رسالت ہے۔ اُن کی شاعری رسمی انداز کی نعتیہ شاعری نہیں بلکہ ذات و صفاتِ محمدیؐ کے بیان کے ساتھ ساتھ دینِ مصطفوی کے اساسی پہلوؤں کی بھی مظہر بن گئی ہے۔ ان پہلوؤں کی تشریح و توضیح میں اکثر جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق و سیرت کا ذکر آیا ہے اور اقبال کی طبعِ عاشقانہ اور مزاجِ شاعرانہ نے ہر جگہ اِس ذکر میں ایک خاص قسم کا لطف سمو دیا ہے۔

چنانچہ اِس ذکر میں اقبال کے یہاں بہت سے اشعار، بہت سے ٹکڑے اور بہت سے ایسے قطعات مل جاتے ہیں جو اقبال کو ایک بلند پایہ نعت نگار ثابت کرتے ہیں۔''

(اُردو کی نعتیہ شاعری، فرمان فتح پوری، صفحہ: ۷۷،۷۵)

اقبال کی وہ شہرۂ آفاق نظمیں جن میں نعت گوئی کے عمدہ نمونے ملتے ہیں، اُن میں ''ذوق و شوق''، ''بلالؓ حضورِ رسالت مآب میں''، ''شفا خانۂ حجاز''، ''بلالؓ روحِ محمدؐ سے'' ہیں۔ کسی میں موٴذنِ رسولؐ کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے اور کسی میں حضرت بلالؓ کا تقابل اِسکندرِ رومی سے کرتے ہوئے دولت وثروت، طاقت وقوت، اقتدار وسلطنت اور ہوسِ حکمرانی وملک گیری پر محبتِ رسولؐ اور چاہتِ نبیؐ کا غلبہ اور فتح دِکھانے کی سعی کی ہے۔ کسی نظم میں شہدائے طرابلس کا ذکر ہے تو کسی میں اصحابِ رسولؐ کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے وابستگی وتعلق اور جذبۂ جاں نثاری کو موضوعِ نعت بنایا ہے۔ ان نظموں کا اگرچہ نعتِ رسولؐ سے براہِ راست تعلق نہیں مگر ان میں سرفروشی کا جذبہ، جامِ شہادت نوش کرنے کی تمنّا وآرزو اور ذاتِ رسالت مآبؐ سے آپؐ کے جاں نثار صحابہ کی والہانہ عقیدت ومحبت کو پیش کیا ہے اور یہ نعت کی انتہا ہے۔

اقبال کا یہ امتیاز ہے کہ حضورؐ سے خطاب کیے بغیر اِنتہائی سلیقے اور ہنرمندی سے حُبِّ نبیؐ اور مدحِ رسولؐ کا اظہار کیا ہے۔ اقبال کا یہ انداز انوکھا اور نرالا ہے جس کی مثال نعتیہ شاعری میں نہیں ملتی۔ اِسی لیے ''ممتاز حسن'' نے اقبال کے بالواسطہ نعتیہ کلام کی پذیرائی اور اُن کی انفرادیت کو ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اِس طرح کی بالواسطہ نعت ایک فنی نزاکت اور شاعرانہ بلاغت کی حامل ہے جو براہِ راست مدحِ رسولؐ میں مشکل سے ملتی ہے۔ براہِ راست اور بلا واسطہ نعتیہ خطاب ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اقبال نے جناب بلالؓ کے واسطے سے بھی رسولؐ کو دیکھا ہے اور خود بھی حضورِ رسالت مآبؐ میں باریابی کی سعادت حاصل کی ہے۔''

علامہ اقبال کی طرح اشرف نقوی کی نعت میں اُن کے عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہونے کی

مثال ملتی ہے:

بس ایک بار مجھے اِذنِ حاضری بخشیں
نہ میری زیست چلی جائے رائیگاں آقاؑ!

❁❁❁❁

میری ہستی کی تیِرہ شب کے لیے
آپؐ ماہِ تمام ہیں آقاؑ!
اپنی قسمت پہ کیوں نہ ناز کریں
ہم تمھارے غلام ہیں آقاؑ!

وہ مذہب سے لگاؤ رکھنے کے ساتھ ایک حسینی بھی ہیں اور اپنے دونوں مجموعوں میں اُنھوں نے واقعہ کربلا کو پیش کیا ہے:

کچھ اِس طرح سے پیاس بُجھی اِک چراغ کی
حلقوم اب بھی خون میں تر روشنی کا ہے
اشکِ غمِ حسینؑ کی تاثیر دیکھیے
ہاتھوں میں میرے آج ہُنر روشنی کا ہے

❁❁❁

اسلام کا چراغ بُجھے گا نہ تا ابد
خون اِس کو دے گئے ہیں شہیدانِ کربلا
ہائے وہ جلتے خیمے ، وہ بچے ، وہ بیبیاں
ہائے وہ وقتِ شامِ غریبانِ کربلا

پروفیسر محمد اکرم سعید اشرف نقوی کے بارے میں کہتے ہیں:

''شاعر اپنے مزاج اور شخصیت کے آئینے کی مدد سے شعر گوئی کے ہُنر کو پرکھنے میں مصروف

نظر آتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں خاص وضع داری ہے جو ان کی شاعری کا بھی خاصا ہے۔''

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کہتے ہیں:

''نہ جانے کیوں میں جب بھی اشرف نقوی کو دیکھتا ہوں تو مجھے امام بخش ناسخ یاد آ جاتے ہیں۔ اُسی طرح دیکھنے میں پہلوان، پرکھنے میں سوجھوان ہیں۔ ان کے کلام پر نظر کریں تو معیار قاری کی بلائیں لینے لگتا ہے۔ سمجھ نہیں آتی کہ ایسے لطیف خیالات، اِتنے نادر استعارے، ایسی اچھوتی تشبیہات، ایسے ناقابلِ یقین امکانات ایسی عظیم جسامت کے ساتھ سمجھوتہ کیسے کر لیتے ہیں؟

اِس کی سب سے بڑی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ اشرف نقوی نے بیس بائیس سال کی ریاضت کے بعد قارئین اُردو ادب کو ۲۰۰۶ء میں ''آخرش'' کا تحفہ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''سبحان اللہ''، ''شاباش''، ''واہ واہ'' کی صدائیں لگاتار ان کے مشامِ جاں کو معطّر کرتی رہیں۔

اب بھی ان کی ہمت ہے کہ ''کاتا اور لے دوڑی'' کے اِس عہد میں انھوں نے نو سال کے طویل وقفے کے بعد ''زادِ حرف'' کی صورت میں قارئین اُردو ادب کے ذہنوں پر پھر دستک کی ہے۔ اِن نو سالوں میں اچھی شاعری کے تعاقب میں اشرف نقوی نے وہ دشت نوردی کی ہے کہ انھیں دیکھ کر مجھے ن۔م راشد کا ''حسن کوزہ گر'' یاد آ جاتا ہے جو اپنی جان سے پیاری ''جہاں زاد'' کو مخاطب کر کے اپنی ہڈ بیتی بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

''جہاں زاد! نیچے گلی میں ترے در کے آگے
یہ میں سوختہ سر حسن کوزہ گر ہوں!
تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطّار یوسف
کی دُکان پر میں نے دیکھا
تو تیری نگاہوں میں وہ تابناکی تھی،
میں جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ وار پھرتا رہا ہوں

جہاں زاد!!! نو سال دیوانہ وار پھرتا رہا ہوں‘‘

ان کی غزل کے چند اشعار درجِ ذیل ہیں:

کچھ سمندر سے ، کچھ ہواؤں سے
کچھ شکایت ہے ناخداؤں سے

❁❁❁

دروغ گو نہیں ، پر مصلحت اِسی میں تھی
کسی کے حق میں بدلنا پڑا بیان مجھے
شکستہ پر بھی ہوں ، منزل بھی دُور ہے اشرف
مگر اِرادہ اُڑاتا ہے بے تکان مجھے

❁❁❁

اِس جہاں کا نظام رُکتا نہیں
میرے آنے سے ، میرے جانے سے

❁❁❁

قصرِ خواب و خیال کو ہم نے
حُسنِ تعمیر سے الگ رکھا

❁❁❁

کہیں سے خشک ، کہیں پر بہت سا پانی ہے
مِری زمین کی رنگت بھی آسمانی ہے

ڈاکٹر خالد ندیم (شعبہ اُردو سرگودھا یونیورسٹی) اشرف نقوی کے اسلوب کے حوالے سے کہتے ہیں:

’’اشرف نقوی عہدِ حاضر کے اُن شعراء میں سے ہیں جو شعر مشاعرے کے لیے نہیں بلکہ سرگوشی کے لیے کہتے ہیں۔ ان کے ہاں لب و لہجے کا دھیما پن، اسلوب کی

شگفتگی اور خیالات کی نُدرت پائی جاتی ہے۔ایسی شاعری جو سُننے کے بعد پڑھتے وقت بھی اپنی تمام تر جمالیات کے ساتھ جلوہ گر ہو، وہی اپنے عہد کو عبور کر سکتی ہے اور اشرف نقوی کی شاعری حال و مستقبل دونوں زمانوں کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔اللہ توفیقات میں مزید اضافہ کرے۔''

اشرف نقوی پُروقار انداز میں لکھتے ہیں ۔ان کی تحریر میں موزوں اور متناسب الفاظ کا انتخاب اور استعمال ہوتا ہے۔مربوط ترتیب جس میں منطقیت ہوتی ہے اور شعریت بھی ،تشبیہ اور استعارے کو اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔ان کی شاعری نغمگی کا احساس دلاتی ہے۔ارتکاز کی عمدہ مثال ہے۔ان کے مصرعوں میں میں برجستگی ،حسن کاری، بانکپن، جمالیاتی شان اور کلاسیکیت موجود ہے۔

اشرف نقوی کی شاعری بالکل ویسی ہی ہے جیسے کہ خود اشرف نقوی۔اس کی شاعری کے تمام تر سوتے اس کی ذات سے پھوٹتے ہیں۔غزل کی زمین کیسی ہی کیوں نہ ہو، اس نے نہایت خوب صورتی سے شعر کہے ہیں اور اِتنی بے ساختگی سے کہے ہیں کہ مجموعے میں شامل شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو جس کے کسی نہ کسی شعر پر بلکہ اکثر غزلوں کے ایک سے زیادہ اشعار پر زبان سے فی البدیہہ ''واہ'' نہ نکلتی ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ اشرف نقوی کے اندر جو تشنگی ہے وہ انھیں سکون سے بیٹھنے نہیں دیتی۔وہ اس پیاس کو بجھانے کے لیے صحرا میں ننگے پاؤں بھاگ رہا ہے، جس سے اس کے پاؤں میں آبلے پڑ رہے ہیں اور خار چبھ رہے ہیں مگر وہ ان کی پروا کیے بغیر مسلسل جستجو میں ہے۔

آنکھوں میں ہیں خواب بھرے
نیند سے بھی بے زاری ہے
اشرف وعدہ کر کے وہ
ملنے سے انکاری ہے

(صفحہ:۶۳)

ایک ایسا اضطراب ہے جو اشرف نقوی کو سونے نہیں دیتا۔ ان کی کیفیت دیوانہ وار صحرا میں بھاگتے مجنوں کی سی ہے جو کہ اندھیروں سے فرار حاصل کر کے روشنی کی طرف بھاگنا چاہتا ہے مگر اندھیرے ہیں کہ صحرا کی طرح طویل ہوتے جارہے ہیں۔

بس ایک شب نے چراغوں سے دشمنی کی تھی
اُسی کے بعد اندھیرا جہاں میں آیا ہے
(صفحہ:۶۷)

اشرف نقوی کا مجموعہ ''آخرش'' کرب و الم کی صورت دکھائی دیتا ہے۔ دُکھوں کے تمام استعارے اس کے مجموعۂ کلام میں بکثرت مل جاتے ہیں۔ شاعر یاسیت کے اندھیروں میں بھٹکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ان اندھیروں میں بھٹکتے ہوئے بھی دُعا کرتا ہے:

میری تقدیر میں بھی خالقِ نور!
کوئی جگنو ، کوئی دِیا کر دے
ہے میری آرزو منظر کو روشنی بخشوں
سو دیپ بن کے اندھیروں میں جل رہا ہوں میں
(صفحہ:۱۶۴)

ڈاکٹر ضیاء الحسن جو معروف شاعر، محقق و نقاد اور پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں وہ اشرف نقوی کے مجموعے ''زادِ حرف'' کے دیباچے بعنوان ''اشرف نقوی کا استعاراتی نظام'' میں تحریر کرتے ہیں:

''اشرف نقوی نے استعاروں کا استعمال وافر مقدار میں کیا ہے۔ استعارے کا ایک کمال یہ ہوتا ہے کہ ہر شعر میں یہ انفرادی معنویت کا حامل ہوتا ہے اور

مجموعی طور پر ایک کُلی معنویت کا حامل بھی ہوتا ہے۔اشرف نقوی کے اشعار میں ''کُن'' کا استعارہ ایک الگ معنویت کا اظہار ہے لیکن مجموعی طور پر اپنے عہد کی صورت کو بھی پیش کرتا ہے۔''

اشرف نقوی کے مجموعے ''زادِ حرف'' میں کچھ اور استعارات بھی ہیں جو بظاہر مختلف ہیں لیکن مجموعی طور پر شاعر کے نظریۂ زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔اِن استعاروں کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تمام ہی چمک دار اور روشن استعارے ہیں جو شاعر کی اِس تمنّا کی عکاسی کرتے ہیں کہ وہ موجودہ زندگی کے تاریک منظر کو روشن دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ایسے استعارے بھی ہیں جو معنوی طور پر چمکدار ہیں جیسے خواب،خود کا دُھندلا پن اور ''ابہام''، اسے باطن میں ایسے تخلیقی جوہر سے جوڑتے ہیں جو روشن زندگی پر منتج ہوتا ہے۔خواب ہر تخلیق اور تخلیقی رویّے کا بنیادی جوہر ہے اور زندگی کے سفر کو آگے بڑھانے کا باعث ہے۔علاوہ ازیں ''چراغ''، ''آئینہ''، ''سورج''، ''ستارہ''، ''آنسو'' اور دیگر کئی ایسے ہی استعارے اس مجموعے میں بکھرے ہوئے ہیں:

آبِ رواں پہ گو کہ ہیں مثلِ حباب ہم
رکھے ہوئے ہیں آنکھ میں صدیوں کے خواب ہم
(صفحہ:۱۱۵)

دیے نے بھی کنارہ کر لیا ہے
ستارہ بھی ہُوا ناشاد ہم سے

❁❁❁

اُسے بھی گھیرا ہوا ہے ہواؤں نے اشرف
جو اِک چراغ شبِ تار کی طرف آیا

❁❁❁

سورج کے سامنے تو نہیں کوئی شے مگر

چمکیں گے ہم ضرور شبِ تار میں میاں!

❁❁❁

عکس ہوں میں ، تُو میرا آئینہ
تیری حیرت سنوارتی ہے مجھے

❁❁❁

دھو ڈالیے اب اشکوں سے ساری زمینِ دل
یہ ہی تو اِس حرم کی صفائی کا وقت ہے

❁❁❁

آبِ رواں پہ گو کہ ہیں مثلِ حباب ہم
رکھے ہوئے ہیں آنکھ میں صدیوں کے خواب ہم

یاسیت اور نا امیدی کے سائے اشرف نقوی کی شاعری میں جگہ جگہ دِکھائی دیتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کے اسلوب کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وصال ہماری شاعری میں منزل کا استعارہ ہے جبکہ اقبال کسی ایک منزل پر اکتفا کرنے والے شاعر نہیں تھے بلکہ منزل کو جمود سمجھتے تھے اور مسلسل سفر، مسلسل حرکت اور مسلسل جدوجہد کو زندگی سمجھتے تھے۔ اشرف نقوی ایک ایسے شاعر ہیں جو فراق پسند نظر آتے ہیں۔ ان کے اِس رویّے کے پس منظر میں کچھ دیگر محرکات نظر آتے ہیں:

خواہشِ وصل کو صورت وہ عطا کر دی ہے
ہجر پائندہ رہے ، ہم نے دُعا کر دی ہے

❁❁❁

مجھے خبر ہے کہ ہوتا ہے کیا فراق کا دُکھ
میں وہ ستارہ ہوں جو کہکشاں سے باہر ہے

❁❁❁

ہجر ہے اِک حقیقتِ ابدی
وصل کا لمحہ کتنا فانی ہے
(ماہنامہ ''ادب دوست'' شمارہ ستمبر ۲۰۱۵ء، ص ۳۷)

اشرف نقوی کی شاعری کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ اُنھوں نے چھوٹی بحر کی غزلیں لکھیں ہیں جو کہ اپنے اندر ایک نشتر سموئے ہوئے ہیں جو کہ قاری کے دل میں پر بڑی کاری ضرب لگاتی ہیں۔ وہ ان اشعار کے حصار سے نہیں نکل سکتا۔ درج ذیل اشعار ملاحظہ کریں:

اِتنا رویا جا سکتا ہے
دشت بھگویا جا سکتا ہے
(صفحہ: ۳۷)

میرے غم کی بابت جان
اور میرا آزار سمجھ
(صفحہ: ۱۴۸)

آنکھ لگتی نہیں لگانے سے
رات گزرے گی کِس بہانے سے
کیا بچے گا ، اگر نکالو گے
میرا کردار اِس فسانے سے
(صفحہ: ۹۰)

اشرف نقوی کے ہاں مصرعوں کی برجستگی اور فراوانی ہے اور اسلوب اِتنا سادہ ہے کہ قاری کو پڑھنے میں دِقت نہیں ہوتی ہے۔ اس کو آسانی سے سمجھ آ جاتا ہے۔ غزل کی مکمل ہیئت میں قافیہ اور ردیف کا بڑا اہم رول ہے۔ قافیہ اور ردیف کا التزام نظم کی مختلف شکلوں میں بھی موجود ہے اور اس سے

نظم کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ نظم کی مختلف شکلوں میں غزل کا آہنگ اور اس کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔اشرف نقوی کے ہاں بھی اس کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے ہاں مصرعے چھوٹی بحر کے ہیں مگر مصنوعی لحاظ سے ربط ہےاور ردیف قافیہ کا بھی باقاعدہ التزام موجود ہے۔

چلی ہے خود سے عجب ایک چال میں نے بھی
دِیا ہے ہجر کو رنگِ وصال میں نے بھی
زمانہ ساز تھے دونوں کہ رسمِ دُنیا کا
خیال اُس نے بھی رکھا ، خیال میں نے بھی
(صفحہ:۳۷)

اشرف نقوی کے ہاں رومانی فضا مصنوعی نہیں لگتی ہے بلکہ حقیقت پسندی کی خوشبو ہے کہ ہر طرف پھیلتی محسوس ہوتی ہے۔رومان کے بغیر زندگی کتنی خالی خالی سی ہوتی ہے اس کا اندازہ تو آپ سب کو ہوگا ہی۔رومان چاہے کائنات کے ہرے بھرے خوب صورت مناظر کا ہو یا انسانوں کے درمیان نازک و پیچیدہ رشتوں کا اسی سے زندگی کی رونق مربوط ہے۔ہم سب زندگی کی سفاک صورتوں سے بچ نکلنے کے لیے رومانی لمحوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ایک جگہ اشرف نقوی لکھتے ہیں:

ہم خواب کے مجرم ، کبھی تعبیر کے مجرم
تجویز کرے نیند ہی تعزیر ہماری
ہر ایک زمانے میں چلے جاتے تھے بے خوف
جب وقت ہوا کرتا تھا جاگیر ہماری
(صفحہ:۴۵)

ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے اشرف نقوی کہتے ہیں:

’’علامہ اقبال نے محبت کو فاتحِ عالم قرار دیا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو تخلیق

کائنات کی بنیاد بھی محبت ہی پر قائم ہے اور محبت کا بھی ایک نہیں، کئی پہلو ہیں اور شاعری میں اگر محبت جیسے لطیف اور ملائم جذبے کا اظہار نہیں تو شاعری صرف بیان بازی ہی رہ جاتی ہے۔ اِس لیے شاعری میں محبت کے پہلو سے انکار کسی صورت بھی نہیں کیا جا سکتا اور یہ شاعری کے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنی کہ زندگی کے لیے آکسیجن۔''

روزنامہ ''پارلیمان نیوز اسلام آباد (گوشۂ ادب) انچارج ندیم گلانی

جو دل پہ گزرتی ہے چھپانی بھی نہیں ہے
بات اُس کو مگر کوئی بتانی بھی نہیں ہے
ہجرت تو بہت دُور کی ہے بات رفیقو!
قسمت میں مِری نقل مکانی بھی نہیں ہے

اس کے علاوہ ایک اور غزل کے اشعار درج ذیل ہیں:

وصل کی شام شبِ ہجر میں تحلیل ہوئی
تب کہیں جا کے مِرے عشق کی تکمیل ہوئی
آ پڑا میری ہی دیوار کا سایہ مجھ پر
دھوپ میرے لیے یوں چھاؤں میں تبدیل ہوئی
نیند کے چاک پہ رکھا مجھے کوزہ گر نے
عالمِ خواب میں گویا مِری تشکیل ہوئی
(صفحہ:۳۴)

اشرف نقوی کے مجموعوں سے اُن کے فن کی پختگی کا احساس ہوتا ہے اور ان کی شاعری پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتی نظر آتی ہے کلاسیکیت، موسیقیت، استعارے، ردیف، قافیہ، برجستہ مصرعوں کا استعمال، محاورت اور ابہام کا جس خوب صورتی سے شاعری میں استعمال کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

حوالہ جات

۱) خالد فتح محمد، ''تبصرہ آخرش''، سہ ماہی ادراک، گوجرانوالہ، اپریل تا جون ۲۰۰۷ء، صفحہ ۱۴۶

۲) صائمہ نفیس، تبصرہ ''آخرش'' ماہنامہ دُنیائے ادب کراچی، جولائی ۲۰۰۹ء، ص: ۴۲

۳) تصور اقبال، ''آخرش''، ماہنامہ نیرنگِ خیال، راولپنڈی، دسمبر ۲۰۰۶ء ص: ۶۰

۴) سرور ارمان، تبصرہ ''زادِ حرف''، روزنامہ نئی بات، لاہور، ۱۹ اپریل، ۲۰۱۵ء ادبی ایڈیشن

۵) اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، ''قلمی دُشمنی''، روزنامہ ''الجریدہ'' لاہور، ۱۸ اپریل ۲۰۰۷ء

۶) سرور الہدیٰ، ڈاکٹر، ''نئی اُردو غزل''، بیکن بکس ملتان، ۲۰۱۵ء، صفحہ ۱۸۱

۷) ایضاً، صفحہ ۱۸۲

۸) شاہین عباس، ''اے مخاطب''، دیباچہ ''آخرش''، ۲۰۰۶ء، صفحہ: ۹

۹) ضیاء الحسن، ڈاکٹر، ''اشرف نقوی کا استعاراتی نظام''، ''زادِ حرف''، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۲

۱۰) ماہنامہ ''عقیدت'' تبصرہ ''آخرش''، سرگودھا، صفحہ نمبر ۲۰۶، ۲۰۷

۱۱) روزنامہ نوائے وقت (ادبی ایڈیشن) لاہور، ۲۴ اگست ۲۰۰۱ء

۱۲) ہفت روزہ ''نائب اللہ''، شیخوپورہ، ۲۰ تا ۲۶ نومبر، ۲۰۰۶ء

۱۳) ماہنامہ ''شام وسحر'' لاہور، فروری ۲۰۰۳ء، صفحہ: ۴۷

باب نمبر ۴

اشرف نقوی کی دیگر ادبی خدمات

اشرف نقوی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اُنھوں نے شاعری کے ساتھ دیگر جہتوں پر بھی کام کیا ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ نقوی صاحب نے کالم نگاری اور ادبی کُتب اور شعراء پر تبصرے بھی کیے ہیں۔ اخبارات اور رسائل میں تواتر کے ساتھ ان کی شاعری، حمد یہ کلام، نعت، سلام، منقبت شائع ہو رہے ہیں۔ اشرف نقوی نے ادبی رسالہ ''کاروان'' (جو کہ بہاول پور سے شائع ہوتا ہے) میں ''شاہین عباس اور خدا کے دن'' کے موضوع پر ایک مضمون لکھا ہے جس میں اُن کی شخصیت اور شعری مجموعہ کے بارے میں سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

شاہین عباس 29 نومبر 1965ء کو شیخوپورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ نہایت خوب صورت اور منفرد لب و لہجے کے مالک اور جدید شاعری میں ایک اہم مقام رکھنے والے ممتاز شاعر ہیں۔ اُنھوں نے نوّے کی دَہائی میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور سے الیکٹریکل انجینئرنگ کی۔ آج کل اورینٹ آپریٹنگ کمپنی میں بطور الیکٹرک انجینئر فرائض سر انجام دے رہے ہیں۔ ادبی سرگرمیوں اور مشاعروں میں بھی پیش پیش رہتے ہیں۔ شاہین عباس کے ہاں الفاظ کا چُناؤ اور مصرعوں میں بے ساختگی بے تحاشا ہے۔ ''خدا کے دن'' شاہین عباس کا شعری مجموعہ ہے جو 2009ء میں منظرِ عام پر آیا ہے، جس کے بارے میں اشرف نقوی اِس طرح لکھتے ہیں:

> ''خدا کے دن''، میں شاہین عباس نے اپنی پہچان ایک نعت گو اور ایک سلام گزار کے طور پر بھی کروائی ہے۔ ان کا نعت اور سلام کہنے کا انداز بھی روایت سے ہٹ کر اور منفرد انداز کا حامل ہے۔'' نعت اور سلام کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

نہ جلوت ایسی کہیں پر ، نہ خلوت ایسی ہے

بس اِک گلی کہ جس میں سہولت ایسی ہے

❁❁❁❁❁

دروازہ نکل آیا اور آقا گزر گئے
تھامے ہوئے بیٹھا تھا میں دیوارِ دو عالم
سب ہاتھ تو بیعت میں برابر نہیں ہوتے
ہر کوئی اُٹھا سکتا نہیں بارِ دو عالم

❁❁❁❁❁

اِسی طرح شاہین عباس کے امامِ عالی مقامؑ کے حضور سلام پیش کرنے کا ذکر بھی کیا ہے:

ہو رہی ہے پھر لہو میں ابتدائے کربلا
سر سے پا تک کچھ نہیں ہے ماسوائے کربلا
زندگی ہی زندگی تھا نوکِ نیزہ پر وہ سر
روشنی ہی روشنی تھی وہ ہوائے کربلا

اشرف نقوی ایک اچھا اور منفرد شاعر ہے۔ ایک عرصے سے یہ باتیں ہو رہی ہیں لیکن ایسا کیوں ہے؟ ہم یہ دعوے کیوں کر رہے ہیں؟ یہ تو نقادوں کا کام ہے کہ اس کے کلام کی ابعاد دریافت کریں۔ وہ جو سب کو اچھا لگتا ہے، اُس کا اچھا پن بیان کیا جائے، اس کی خامیاں سامنے لائی جائیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ نقاد بوڑھے ہو لیے۔ اب وہ کہتے ہیں کہ اُنھوں نے جو کہنا تھا وہ کہہ چکے، جو کرنا تھا وہ کر چکے۔ اب نیا شاعر اپنا نقاد اپنے ساتھ لے کر آئے۔ بات جچتی ہے لیکن نیا نقاد کہاں سے آئے گا۔ میں اور آپ، سب نقاد ہیں لیکن ضرورت حوصلے کی ہے اور نیا نقاد یعنی میں اور آپ ابھی اپنے اندر اتنا حوصلہ پیدا ہی نہیں کر پائے کہ اشرف نقوی جیسے توانا شاعر پر کُھل کر بات کر سکیں۔ سب سے بڑا مسئلہ تو اشرف نقوی خود ہے کہ بحیثیت انسان وہ جتنا سادہ اور عام سا ہے، بطور شاعر اُتنا ہی گنجلک۔

یہ سیدھا سادہ اور عام سا انسان اپنے اندر جس شاعر کو لیے پھرتا ہے وہ عام قاری کا شاعر نہیں ہے۔اس کو نہ صرف اپنا نقاد خود پیدا کرنا ہوگا بلکہ اپنی سطح کے قاری بھی دریافت کرنا ہوں گے۔ ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں اس کے شاعر ادیب چونکا دینے والی فضا کی تخلیق میں لگے رہتے ہیں۔کوئی انوکھی بات،کوئی ایسا تجربہ کہ سُننے والے ایک دم عش عش کر اُٹھیں،لیکن مطمعِ نظر چونکہ محض قاری کو ہکا بکا کر دینا ہوتا ہے،اس لیے شاعر کے ہاں ایک سطحی پن در آتا ہے اور یہی سطحی پن لمحوں، دِنوں یا زیادہ سے زیادہ مہینوں میں اس کی تخلیق کی عمر کا تعیّن کر دیتا ہے اور یوں ہم چند مشاعروں، کچھ ادبی جریدوں اور ایک آدھ مجموعۂ کلام کے بعد ان شعراء کے ناموں سے بھی نامانوس ہو جاتے ہیں۔ تخلیقی گہرائی کا فقدان ان حضرات کو لے ڈوبتا ہے۔ واہ واہ تو ذوقؔ کے کلام پر بھی ہوئی لیکن ابدی حیات غالب کے حصّے میں آئی۔

ذاتی واردات،خالص ذاتی مشاہدہ،اپنا تجربہ اور گہرا غور وخوض اشرف نقوی کی غزل کے بنیادی عناصر ہیں۔اس کے ہاں ہمیں سُنی سُنائی باتیں نہیں ملتیں، نہ سطحی پن ہے۔ ہر چیز ایک خاص ترتیب،خاص سلیقے سے پیش کی گئی ہے کہ اس کے پیچھے ایک جان کاہ ریاضت ہے۔ ہر چیز کو اپنی تجربہ گاہ سے گزارا گیا ہے، جہاں اس کا مشاہدہ،تجربہ اور فکر اس کی عمل انگیز طبیعت کی کٹھالی میں پک کر ایک آمیزے کا روپ دھارتے ہیں اور جب یہ آمیزہ ہمارے دل ودماغ پر دستک دیتا ہے تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ کچھ ہے جو بالکل نیا ہے،خالصتاً اشرف نقوی کا ہے۔

اِک خواب کی مانند حقیقت تھی ہماری
دریا تھے مگر دشت سی صورت تھی ہماری
اِس درجہ یگانہ ہوئے ہم اپنے جنوں میں
ہر دشت میں پہنچی ہوئی وحشت تھی ہماری

اشرف نقوی اپنی تاریخ،اپنے ادب اور اپنی مٹی سے جڑا ہوا انسان ہے۔اس نے غزل کی

روایت کے جملہ التزامات کوملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اسے جدید حسیّت سے آشکار کیا ہے۔اس کے ہاں معاملاتِ محبت کے ساتھ ساتھ،معاشی،معاشرتی اور سماجی سچائیوں اور درپیش صورتِ حال پر گہری نظر ملتی ہے۔معاشرے میں جاری وساری ناانصافی،زوال اور اقدار کی گراوٹ اور برہمی پر اس کے ہاں شدید لیکن قدرے سنبھلا ہوا رویّہ ملتا ہے۔جھنجھلاہٹ کہیں بھی اس کی راہ کی رکاوٹ نہیں بن پائی۔

محبت اور معاشرتی معاملات پر قلم اُٹھاتے ہوئے اکثر تخلیق کار جلد بازی اور سطحی پن کا شکار ہو جاتے ہیں۔فوری ردِّعمل اُن کی تخلیق کا حُسن چھین لے جاتا ہے لیکن اشرف نقوی کو کوئی جلدی نہیں۔وہ تو معاملات کی تہہ تک جانے کا حوصلہ رکھتا ہے اور خوبی،خرابی کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی جڑ تک پہنچ کر اصل حقائق سے روشناس کراتا ہے۔

زباں سے نکلی تو لب تک صدا نہیں پہنچی
کبھی فلک پہ مِری التجا نہیں پہنچی
تمھارے ہجر میں ہجرت کا بوجھ اُٹھائے ہوئے
کہاں کہاں پہ مِری خاکِ پا نہیں پہنچی؟

اشرف نقوی ایک جگہ پر شاہین عباس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''شاہین عباس کے اِس شعری مجموعے نے نہ صرف ان کے ادبی قد کاٹھ میں اضافہ کیا ہے بلکہ مجھ جیسے قاری کے ساتھ ساتھ اہلِ نقد ونظر کو بھی خوش گوار حیرت میں مبتلا کر دیا ہے۔''

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ شعراء اور نثر نگار اپنی شہرت اور دولت کی خاطر ادب میں تگ ودَو کرتے ہیں لیکن اشرف نقوی ایسی شخصیت ہیں جنھیں کسی شہرت کی ضرورت نہیں کسی شے کا لالچ نہیں۔وہ اپنی تخلیقات کا غرور نہیں کرتے۔وہ تو قلندرانہ مزاج رکھتے ہیں۔مثل مشہور ہے''گدڑی میں لعل ہونا''۔گویا وہ سادہ مزاج اور شریف النفس انسان ہیں۔

''اصل'' کی تلاش ہر دور میں انسانی فطرت کا خاصہ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی سرشت میں تفتیش کا مادہ رکھ چھوڑا ہے۔ حقیقتِ حال تک رسائی کے لیے ہر دور میں شعراء ادیب اور دانش ور، فلسفی اپنے اپنے مسلک اور طریقہ کار کے مطابق مصروفِ کار رہے ہیں۔ اِس سلسلے میں دو مکتبہ ہائے فکر ہمیشہ معروف ومقبول رہے ہیں۔ ایک تصوّف یا وجدان اور دوسرا عقلیت یا معقولیت۔ وجدانی کہتے ہیں کہ حقیقت مادی تصوّرات اور علم کے ذریعے ہماری آگاہی میں نہیں آسکتی اور عقلیت پرست طبقہ دوسرے سِرے پر کھڑا نظر آتا ہے۔

اشرف نقوی نے کمال یہ کر دکھایا ہے کہ وجدان اور عقلیت دونوں کو شانہ بشانہ لے کر چلا ہے اور جہاں، جیسے، جوممکن ہوا کر دِکھایا ہے۔ وہ سوال اُٹھاتا ہے، وہی صدیوں پرانے سوالات، لیکن پیرایۂ اظہار اور اندازِ بیان اُسے دوسروں سے کوسوں دُور رکھتے ہیں۔

جو عجب خواب ہمیں دن میں دِکھائے گئے تھے
جانے کس شہرِ طلسمات سے لائے گئے تھے
یہ جو دریا سا رواں آنکھ میں تم دیکھتے ہو
جب ہوئے راکھ تو ہم اِس میں بہائے گئے تھے

اشرف نقوی کا اصل مسئلہ ''خدا'' نہیں ''انسان'' ہے۔ اسے انسان سے دلچسپی ہے۔ اپنے جیسے جیتے جاگتے انسان سے۔ اس انسان کے معمولات سے، اُس کے شب وروز سے، اس انسان کی خوشیاں، اُس کے دُکھ سُکھ اس کی شاعری کا موضوع ہیں۔ عہدِ حاضر کا انسان جن نفسیاتی مسائل سے دوچار ہے، اشرف نقوی کے ہاں ان کا انتہائی مخلصانہ تجزیہ ملتا ہے۔ اس انسان کی حقیقت کیا ہے اور حیثیت کیا؟ یہی وہ چیزیں ہیں جو اس کے شب وروز کا وظیفہ ہیں۔

ہجر میں کیا ہے اور وصال میں کیا
چھوڑ ، رکھا ہے اِس سوال میں کیا

آنکھ سرشار ، مسکراتے لب
کوئی آیا ترِے خیال میں کیا

وقت خصوصًا گزرتا وقت اشرف نقوی کا مسئلہ ہے لیکن انھوں نے وقت کو دُشمن کی شکل میں پیش کرنے کی بجائے ایک منصف اور جاری وساری قوت کے طور پر اُبھارا ہے۔ انسان اپنے معاملات میں اِس قدر اُلجھ کر رہ جاتا ہے کہ وہ گزرتے وقت سے قطعی بے خبر ہو کر رہ جاتا ہے۔ رواں دواں وقت کے تقاضے اس کے دھیان کی قرطاس پر اپنی جگہ نہیں بنا پاتے اور جس وقت اسے اپنی اِس کوتاہی کا احساس ہوتا ہے، منظر بدل چکا ہوتا ہے۔ بہت کچھ پیچھے رہ جاتا ہے اور انسان پچھتاوے اور مایوسی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ بعد ازاں یہی پچھتاوا اور مایوسی اُس کے مسائل کے بنیادی مآخذ ٹھہرتے ہیں۔ ماضی اُس کے دھیان میں گونجنے لگتا ہے۔

میرے چہرے سے بات کیا کرتا
آئینہ شش جہات میں گم تھا
اُس کی آنکھوں میں ڈوب کر جانا
مَیں عبث کائنات میں گم تھا

بہاول پور سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ''کارواں'' میں اشرف نقوی کی ایک غزل بھی شائع ہوئی ہے جس کے چند اشعار درجِ ذیل ہیں:

کُھل کے جو رونا چاہا تو رویا نہ جا سکا
دامن ذرا بھی دل کا بھگویا نہ جا سکا
اُس نے تو وعدہ کر بھی لیا تھا وصال کا
ہم سے ہی داغِ ہجر کو دھویا نہ جا سکا
یادوں کی بھیڑ سے ہی مِرا کمرہ بھر گیا

رات اِس قدر تھا شور کہ سویا نہ جا سکا
اشرف وہ آج آئے ہیں کرنے کو معذرت
ہم سے ترے خیال میں کھویا نہ جا سکا

رسالہ ''کارواں'' ہی کے ایک اور شمارہ میں اشرف نقوی نے ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ''خاکہ مستی'' ہے جو ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے خاکوں کے مجموعے ''خاکہ مستی'' کے حوالے سے تحریر کیا گیا ہے۔ اِس حوالے سے اشرف نقوی لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر اشفاق احمد ورک بیسویں صدی کے آخری عشرے کے آغاز میں ''قلمی دشمنی'' کے ساتھ ادبی منظر نامے پر طلوع ہوئے اور آج ان کی کامیابیوں کا خورشید آسمانِ مزاح کے نصف النّہار پر پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ وہ طنز و مزاح کے میدان کے شہسوار ہی نہیں بلکہ تنقید و تحقیق کے سمندر کے شناور بھی ہیں۔
>
> حال ہی میں ڈاکٹر صاحب کی طنز و مزاح پر مبنی تازہ ترین تصنیف ''خاکہ مستی'' شائع ہوئی ہے جو اپنے اندر طنز و مزاح کے کئی کھٹے میٹھے، کڑوے کسیلے ذائقے سمیٹے ہوئے ہے۔ شخصی خاکے، کرداری خاکے، اخلاقی کہانیاں، افسانچے، غالب کے خطوط کی پیروڈی، علامتی افسانے اور ''بلیغیات'' کے زیرِ عنوان چٹ پٹے اقوالِ زرّیں کتاب کا حصّہ ہیں۔''

اشرف نقوی نے اپنے اِس مضمون میں ڈاکٹر صاحب کے طنز و مزاح سے بھرپور خاکوں سے اقتباسات کی خوب صورت مثالیں دی ہیں:

> ''ان کی شکل دیکھ کر ان کی عمر کا اندازہ لگائیں تو لگتا ہے قلی قطب شاہ کے کلاس فیلو ہوں گے۔ ان کو پیچھے سے دیکھیں تو گوتم بُدھ لگتے ہیں، سامنے سے دیکھیں تو منگل بُدھ لگتے ہیں۔ چال ایسی کہ سڑک پر پیدل چل رہے ہوں تو لگتا ہے گھر والوں نے چابی بھر کے چھوڑا ہے۔''

(الہڑ بلہڑ باوے دا)

''آپس کی بات ہے کہ کارِ جہاں ہے ہی اِتنا دراز اور دُشوار کہ اسے نمٹاتے نمٹاتے کسی کے بال سفید ہو جاتے ہیں تو کسی کا خون۔''

''زاہد منیر عامر صاحب تو شعبۂ اُردو کے وہ نوجوان بزرگ ہیں جو آغا حشر کا شعر بھی اِتنے دھیمے انداز میں پڑھتے ہیں کہ فانی بدایونی کا محسوس ہونے لگتا ہے۔ کسی کو ڈانٹیں بھی تو لگتا ہے کہ وصیت کر رہے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں کبھی گھر جاتے تو اہلِ خانہ سوچ میں پڑ جاتے کہ ان کے لیے شادی کا بندوبست کیا جائے یا حج کا۔ یہ تو اپنی بارات میں بھی اِتنی سنجیدگی سے بیٹھے تھے جیسے ریٹائرمنٹ کی تقریب ہو۔''

(نوری اور ناری)

''ازدواجی معاملات میں ''کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الزَّوج'' کے قائل ہیں اور اِتنے قائل ہیں کہ شادی کے تیسرے برس ہی کئی بچوں کے باپ بن چکے تھے۔

(خالص ندیم)

اشرف نقوی نے اس مضمون کے آخر میں ڈاکٹر صاحب کو داد و تحسین پیش کی ہے اور بیان کیا ہے کہ:

''خاکہ مستی'' یقیناً مزاحیہ ادب میں گراں قدر اضافہ ہے اور یہ کتاب ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے ادبی مقام اور قدکاٹھ میں مزید بلندی اور اضافے کا سبب بنے گی۔''

سہ ماہی رسالہ ''کارواں'' بہاول پور (شمارہ اپریل تا دسمبر 2011ء) میں اشرف نقوی کی ایک نظم شائع ہوئی جس کا عنوان تھا: ''اے چارہ سازو!''

اے چارہ سازو!

مجھے بتاؤ اے چارہ سازو!
میں کب تلک یوں تمھارے ہاتھوں سے
گھاؤ پر گھاؤ ہی سہوں گا
تُمھی بتاؤ

کہ نیم مُردہ، کٹے پھٹے سے

دریدہ تن پر

ہزاروں زخموں کا یہ لبادہ

پہن کے کب تک میں جی سکوں گا

ذرا بتاؤ

کہ کوئی اپنے ہی آشیاں کو

خود اپنے ہاتھوں اُجاڑتا ہے؟

ہے کوئی ایسا جو کاٹتا ہے

وہ شاخ جس پر ہو آشیانہ

ہے کوئی ایسا مکیں بتاؤ

جو اپنے گھر کو جلائے

اور پھر تماشا دیکھے

مجھے یقیں ہے، وہ تم نہیں ہو

وہ تم نہیں ہو تو پھر بتاؤ

کہ کب تلک تم اُڑاؤ گے یوں

لہو کے چھینٹے

اُتارے جاؤ گے میرے سینے میں

کب تلک یوں ہی تیر و خنجر

میں جانتا ہوں۔۔۔۔

مجھے خبر ہے کہ تم یہ سب کچھ

نہ اپنی مرضی سے کر رہے ہو

نہ اپنی مرضی سے جی رہے ہو

نہ اپنی مرضی سے مر رہے ہو

یہی حقیقت ہے چارہ سازو!

اشرف نقوی نے ''حیاتِ قائدِ اعظم کے چند اوراق'' کے عنوان سے ماہنامہ ''تخلیقات'' شیخوپورہ (شمارہ ستمبر 1999ء) میں ایک مضمون تحریر کیا جس میں وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کی حیات اور اُن کی قومی و ملّی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قائدِ اعظمؒ نے مستقل مزاجی، محنت اور جدوجہد سے نہ صرف برِصغیر کا نقشہ بدل دیا بلکہ مسلمانانِ برّصغیر کے لیے ایک علیحدہ وطن کے حصول کو بھی ممکن بنایا۔ وقت کے پابند ہونے کے ساتھ ساتھ قائدِ اعظم نہایت اصول پسند بھی تھے۔''

یہ مضمون اشرف نقوی کی قائدِ اعظمؒ سے دلی محبت اور لگاؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ اُنھوں نے قائدِ اعظم کے بہت سے واقعات، اُن کے فرامین اور اُن کی تقاریر کو اس مضمون کی زینت بنایا ہے۔ قائدِ اعظمؒ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

''اُن میں خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آپ مشکل سے مشکل حالات میں بھی نہیں گھبراتے تھے بلکہ پُراعتماد اور پُرسکون رہتے تھے۔ آپ کی خود اعتمادی کا واقعہ کچھ یوں ہے کہ دِلّی کے امپیریل ہوٹل میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا۔ صدارت قائدِ اعظمؒ فرما رہے تھے۔ قائدِ اعظمؒ اپنی صدارتی تقریر فرما رہے تھے کہ باہر سے کچھ شور سُنائی دیا۔ کونسل کے ارکان ایک دم کھڑے ہو گئے اور قائدِ اعظمؒ کو حصار میں لے لیا۔ جن کے پاس پستول تھے اُنھوں نے پستول نکال لیے۔ قائدِ اعظمؒ نے فرمایا: ''آپ بیٹھ جائیں کہ میں تقریر کر رہا ہوں۔ حاضرین نے پہلی مرتبہ اپنے قائد کی نافرمانی کی۔ اُنھیں اپنے قائد کی زندگی اُن کی مرضی سے بھی پیاری تھی۔ سردار عبدالرّب نشتر صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے باہر آئے تو دیکھا، ایک خاکسار سیڑھیاں چڑھ کر ہال کی طرف آ رہا ہے۔ قائدِ اعظمؒ کے اس پٹھان جاں نثار نے اپنی عمر، اپنے عہدے کا لحاظ کیے بغیر اُس خاکسار کو اِس زور کا دھکا دیا کہ وہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے جا گرا۔

اِس سارے معاملے میں قائدِ اعظمؒ ایسے پُرسکون اور مطمئن رہے جیسے ہمیشہ رہتے تھے۔
''حیاتِ محمد علی جناح'' کے مصنّف رئیس احمد جعفری نے قائدِ اعظم کی حیات کے کئی واقعات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک دفعہ سرکاری استعمال کے لیے صرف سینتیس (۳۷) روپے کا فرنیچر لایا گیا۔ قائدِ اعظمؒ نے لسٹ دیکھی تو دیکھا کہ اس میں سات روپے کی کرسیاں اضافی آئی ہیں۔ آپ نے پوچھا ''یہ کس لیے ہیں''؟ کہا گیا: ''آپ کی بہن فاطمہ جناح کے لیے۔'' آپ نے وہ کاٹ کے فرمایا: ''اس کے پیسے فاطمہ جناح سے لو۔''

اس طرح کے بہت سے سیاسی واقعات قائدِ اعظمؒ کی حیات سے وابستہ ہیں جن کا ذکر اشرف نقوی نے اپنے اِس مضمون میں کیا۔ مضمون کے آخر میں وہ قائدِ اعظم کے بارے میں ایک شعر لکھتے ہیں:

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جُنبِش میں
جسے غرور ہو ، آئے ، کرے شکار مجھے

ماہنامہ ''سخن ور'' کراچی کے جولائی 2000ء کے شمارے میں صفحہ ۴۳ پر ان (اشرف نقوی) کی غزل شائع ہوئی جس کے اشعار درج ذیل ہیں:

چھلکتی آنکھ سے دیکھو کہ کیا نظارہ گرا
یہ چاند ٹوٹ گِرا یا کوئی ستارہ گِرا
تمھارے دل کے حسیں آسماں پہ چمکے گا
ہماری آنکھ سے آنسو اگر ہمارا گِرا
شبِ سیاہ میں وہم و گماں کی جھولی سے
یقین بن کے نئے دِن کا اِستعارہ گِرا
بیاضِ جاں میں جو لکھے ہیں شعر اشرف نے

زمینِ دل پہ کبھی اُن کا اِک شمارہ گِرا

ماہنامہ ''سخن ور'' کراچی کے 1999ء میں شائع ہونے والے ایک شمارے میں ''سلامِ عقیدت بحضور امامِ عالی مقام'' کے نام سے ایک سلام چھپا جس کے اشعار درج ذیل ہیں:

حق گوئی کی دلیلِ منوّر حُسینؑ ہے
ظلمت میں روشنی کا پیمبر حُسینؑ ہے
صبر و رضا ہی جس کی متاعِ حیات تھی
تصویر وہ وفا کی سراسر حُسینؑ ہے
ہر دَور میں رہے گا مقابل یزید کے
باطل کی بدنصیبی کا مظہر حُسینؑ ہے
پُھوٹی تھی کربلا میں شہیدوں کے خون سے
خوشبو رضا کی جس سے معطّر حُسینؑ ہے
اشرف اُسی کے نام سے نسبت رہے مجھے
میری عقیدتوں کا تو محور حُسینؑ ہے

سہ ماہی رسالہ 'عطا' سال نامہ 2015ء میں اشرف نقوی کی دو غزلیں شائع ہوئیں:

ہُوا زمیں سے جُدا اور آسماں سے الگ
میں تجھ کو چھوڑ کے ہوتا گیا جہاں سے الگ
تِری طرح میں تِری زندگی میں شامل ہوں
کرے گا دوست! مجھے تُو کہاں کہاں سے الگ
ہمیشہ مجھ کو اُسی میں رکھا گیا اشرفؔ
جو ایک صف ہے یہاں بزمِ دوستاں سے الگ

ایک اورغزل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں:

رنج ہستی کے اُٹھانے کے لیے آیا ہوں

میں یہاں ہجر کمانے کے لیے آیا ہوں

تجھ سے ہونے کا نہیں کارِ محبت تنہا

سو ترا ہاتھ بٹانے کے لیے آیا ہوں

میں گئے وقت کی صورت نہیں آنے والا

بس یہی بات بتانے کے لیے آیا ہوں

شاعری گویا کہ ہے دشت نوردی اشرفؔ

سو یہاں خاک اُڑانے کے لیے آیا ہوں

مئی 2017ء ''عکاس انٹرنیشنل'' کتاب نمبر 26 میں اشرف نقوی کا مضمون ''پانیوں سے الگ اورشمشیر حیدر کا فن'' شائع ہوا جس میں اُنھوں نے شمشیر حیدر کے فن کے بارے میں بات کی ہے اور اُن کے شعری مجموعہ ''پانیوں سے الگ'' پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اشرف نقوی لکھتے ہیں:

''خوب صورت اور جان دار مصرعے، خیال پر گرفت اور قادر الکلامی اس شعری مجموعے کی نمایاں خصوصیات ہیں جو شمشیر حیدر کو اپنی نسل کے شعراء میں ممتاز کرتی ہیں۔''

اِس مضمون میں اُنھوں نے شمشیر حیدر کے نمایاں اور ممتاز اشعار کو بھی مضمون کی زینت بنایا ہے۔

پہلے تو پانیوں سے رہی گفتگو مِری

پھر یوں ہوا کہ آئینہ ایجاد ہو گیا

بنا رہا تھا پرندہ میں ایک کاغذ پر

کہ خود بھی اُڑنے لگا اُس کے پر بناتے ہوئے

میں تجھ کو ہار کے ایسے نہ زندگی کرتا

اگر نہ حوصلے ہوتے جواریوں والے

شمشیر حیدر کے پہلے مجموعہ کا نام ''دشتِ خواب'' تھا۔اس کے بعد دوسرا مجموعہ پانیوں سے الگ'' شائع ہوا۔اس میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جو قاری کو ایک خوش گوار حیرت میں مبتلا کرتے ہیں اور بہت سے مقامات پر ٹھہر کر واہ واہ کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔''

کچھ اشعار جو اُنھوں نے اس مجموعے سے منتخب کیے، درجِ ذیل ہیں:

اُڑنے کا اختیار کہاں میرے پاس تھا

بس بال و پر کے دھوکے میں رکھا گیا مجھے

شبیں جہاں اپنی حکمرانی کا سوچتی ہیں

چراغ بن کر وہیں پہ جلتے ہیں دن ہمارے

تِرے صحرا کی جتنی پیاس بھی ہو

مِری آنکھوں کا پانی ہی بہت ہے

تمھیں برباد کرنے کو تمھارا

خمارِ حکمرانی ہی بہت ہے

مجھے حیرت سے دریا کیوں نہ دیکھے

طبیعت میں روانی ہی بہت ہے

شمشیر حیدر کی شاعری میں ظلم اور ناانصافی کے خلاف احتجاج کا ذکر کرتے ہوئے اشرف نقوی اُن کے اشعار دُہراتے ہیں:

جب تلک شب کی حمایت نہیں جانے والی

میرے اطراف سے وحشت نہیں جانے والی

اپنوں کے رویوں سے شاکی شمشیر حیدر لکھتے ہیں:

اب یہ جانا کہ سرابوں سے گزر تھا میرا
میں تو سمجھا تھا کہ احباب مِرے اپنے ہیں

یہی نہیں کہ دُعائیں اثر سے خالی ہیں
یہاں کے پیڑ بھی برگ و ثمر سے خالی ہیں

آخر میں وہ شمشیر حیدر کو ''پانیوں سے الگ'' کی اشاعت پر دِلی مبارک باد اِس دُعا کے ساتھ دیتے ہیں کہ:

''اللہ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔''

مضمون کا اختتام وہ شمشیر حیدر کے چند اشعار پر کرتے ہیں جو درجِ ذیل ہیں:

زندگی ! یاد تو آئے گا میرے بعد تجھے
ڈوبتے وقت مِرا ہاتھ ہلاتے رہنا

خدا سے اپنا تعلق بھی ہے تو بس اِتنا
کہ اپنی اپنی ضرورت میں یاد آتا ہے

خالی ہاتھوں کو نہ دیکھو ، مِری آنکھیں بھی پڑھو
جو خزانے ہیں تہہِ آب ، مِرے اپنے ہیں

تم ایک بار مِری جاں تو مانگتے مجھ سے
تمھاری مُٹھی میں رکھتا یہ کائنات اپنی
(ص:۹۲،۹۳)

اشرف نقوی نسلِ نو کے اُن نمائندہ شعراء میں سے ہیں جن کی آواز منفرد اور لہجہ توانا ہے۔ شاعروں کے جمِّ غفیر میں اپنی الگ شناخت بنانا اور پھر اُسے قائم رکھنا ہر کس و ناکس کے بس کا کام نہیں۔ کتنے ہی شاعر ادبی اُفق پر ابرِ رواں کی طرح آئے، کچھ بوندا باندی کر کے اور کچھ بِنا برسے ہی ہوا ہو گئے۔ لیکن کچھ شعراء ایسے ہوتے ہیں کہ جو اپنا کام آہستہ روی سے کرتے ہیں اور آسمانِ ادب پر آفتاب و ماہتاب کی طرح جگمگاتے ہیں۔ اشرف نقوی کا شمار بھی شاعروں کے اِسی قبیلے سے ہے۔ خوب صورت اور جان دار مصرعے، خیال پر گرفت اور قادر الکلامی اس کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں جو اشرف نقوی کو اپنی نسل کے شعراء میں منفرد اور ممتاز حیثیت دلا رہی ہیں۔

چلتا ہوں روز و شب مَیں ڈگر کے بغیر بھی
منزل کی ہے تلاش سفر کے بغیر بھی
گھر میں پڑا پڑا ہی تھکن سے نڈھال ہوں
پاؤں میں آبلے ہیں سفر کے بغیر بھی

''آخرش'' کے بعد 2015ء میں منصۂ شہود پر آنے والے شعری مجموعے ''زادِحرف'' میں بھی اشرف نقوی نے اپنا معیار گرنے نہیں دیا اور قاری کو عمدہ، خوب صورت اور دل کش اشعار دیے۔ ''زادِحرف'' کا مطالعہ قاری کو ایک خوش گوار حیرت میں مبتلا کرتا ہے اور وہ بہت سے مقامات پر ٹھہر کر واہ واہ کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آیئے کچھ اشعار دیکھتے ہیں:

کسی کی یاد سہارا شبِ فراق کا ہے
دل ایک ٹوٹا ستارہ شبِ فراق کا ہے

ہے کیا مجال ، یہاں اہلِ وصل آ جائیں
یہ دشت سارے کا سارا شبِ فراق کا ہے
جو ایک بار ہوا غرق ، پھر نہیں اُبھرا
کچھ ایسا گہرا کنارہ شبِ فراق کا ہے

موجودہ ادبی منظرنامے میں جو شاعری ہو رہی ہے اُس میں ''چراغ، خواب، دشت، ستارہ، ہوا، مٹی، خاک، چاک، پانی، کوزہ گر، دریا، سمندر، آنکھ اور آنسو'' جیسے استعارے شاعروں کے پسندیدہ استعارے ہیں۔ ان بار بار برتے ہوئے استعاروں کا منفرد انداز میں استعمال ہی کسی شاعر کی الگ شناخت کا باعث ہوتا ہے، ورنہ کسی استعارے کے بار بار ایک ہی انداز میں استعمال پر جگالی یا کلیشے کا گمان ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

اشرف نقوی کی خوبی یہ ہے کہ اس نے مندرجہ بالا استعارات اور علامات کو کم، جب کہ ''دشت''، ''کربلا''، اور ''وحشت'' کو اِس طرح استعمال کیا ہے کہ خود پر کسی دوسرے کی چھاپ نہیں لگنے دی۔ اشرف نقوی کا اپنا ایک استعاراتی نظام ہے جس کے اندر رہتے ہوئے اُس نے اپنی پسند کے استعارات، علامات، تلمیحات اور تراکیب کو خوب برتا ہے لیکن نقالی اور جگالی نہیں کی۔ اس نے بنے بنائے رستے پر چلنے سے گریز کرتے ہوئے اپنا راستہ خود بنانے کی کوشش کی ہے اور اپنے لیے جداگانہ اور منفرد راستے کا انتخاب کیا ہے۔ اس نے اپنے شعری سفر میں اپنے قاری کو پوری طرح شریک رکھا ہے اور قاری بھی اشرف نقوی کا شریکِ سفر بنتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہے۔

مکے سے چل پڑا ہے جو مہمانِ کربلا
وا ہونے کو خوشی سے ہے دامانِ کربلا
اسلام کا چراغ بُجھے گا نہ تا ابد
خون اِس کو دے گئے ہیں شہیدانِ کربلا

''زادِحرف'' کی غزلوں میں اشرف نقوی نے غزل کے جدید اسلوب کو اپنایا ہے اور اپنے ہم عصر شعراء کے لیے ایک راہ متعیّن کردی ہے کہ جدید تر غزل کیا ہے۔ روایت اور جدت کی آمیزش نے اس کی غزل کو وہ لازوال خوب صورتی عطا کی ہے جو بہت کم شاعروں کے حصّے میں آتی ہے۔ سادات اور حُسینی ہونے کی نسبت سے واقعہ کربلا اور شہادتِ عظمیٰ کے حوالے سے تلمیحات و استعارات اشرف نقوی کی غزل کے اضافی اوصاف ہیں جو اسے اپنے ہم عصروں میں نمایاں اور ممتاز کر رہے ہیں۔

ہائے وہ جلتے خیمے ، وہ بچے ، وہ بیبیاں
ہائے وہ وقتِ شامِ غریبانِ کربلا
آ جایئے مدد کو ہماری بھی یا حُسینؑ!
ہم پر ستم کناں ہیں یزیدانِ کربلا

پندرہ روزہ رسالہ ''روشنی'' پشاور کے نومبر 2002ء کے شمارے میں اشرف نقوی کی نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم شائع ہوئی جس کے اشعار درجِ ذیل ہیں:

شام و سحر کو میرے ، اُجالوں سے بھر دیا
مجھ بے ہُنر کو اعلیٰ کمالوں سے بھر دیا
اپنی ثنا کی مجھ کو سعادت اُنھوں نے دی
اِس ذہنِ نارسا کو خیالوں سے بھر دیا
اُنؐ کی عطائے خاص ہے یہ نورِ آگہی
بابِ دیارِ علم کمالوں سے بھر دیا
یہ کائنات پہلے تو بے رنگ و رُوپ تھی
حُسنِ نبیؐ نے اِس کو جمالوں سے بھر دیا
اشرفؔ ابد نشاں ہے جو سیرت نبیؐ کی ہے
قرآں کو رب نے اُن کی مثالوں سے بھر دیا

ماہنامہ ''بیاض'' لاہور کے دسمبر 2012ء، شمارہ نمبر 12 میں اشرف نقوی صاحب کی غزلیں اور ایک خط شائع ہوا ہے۔ غزلوں کے اشعار درجِ ذیل ہیں:

کچھ ایسا زادِ حقیقت مِرے گمان میں تھا
مَیں امتحاں سے گزر کر بھی امتحان میں تھا

تمھارے نام کی نسبت سے معتبر ٹھہرا
وگرنہ ذکر کہاں میرا داستان میں تھا

نہ اب بدن میں حرارت ، نہ زندگی کی رمق
کل ایک بُجھتا ہوا شعلہ خاک دان میں تھا

بدن سے طائرِ جاں جب رِہا ہوا اشرف
تو ایک نشّہ خوشی سے بھرا اُڑان میں تھا

دوسری غزل کے اشعار درجِ ذیل ہیں:

جب کہ اُونچا ہو نام خواہش کا
کیوں نہ دل ہو غلام خواہش کا

آپ نے جب کہا ، یہ جاں دے دی
یوں کیا احترام خواہش کا

دیکھنے والو! دیکھ لو مجھ کو
میں ہوں نقشِ دوام خواہش کا

دل کو دے کر سزائے ہجر و فراق
کام کر دو تمام خواہش کا

زیست اشرفؔ غلام ہے اُس کی
ہو گیا جو امام خواہش کا

تیسری غزل کے اشعار کچھ یوں ہیں:

ہم خواب ہیں اور اُلٹی ہے تعبیر ہماری
منظر میں کہاں جچتی ہے تصویر ہماری
دریاؤں سے کچھ ربط ہوا اِتنا زیادہ
پانی پہ لکھی لگتی ہے تقدیر ہماری
ہم ذات میں اپنی کسی صحرا کی طرح ہیں
ہو پائے گی تم سے کہاں تسخیر ہماری
بہہ جائیں گے اشرفؔ کسی دریا کی طرح ہم
در آئے گی لہروں میں بھی تاثیر ہماری

آخر میں اُنھوں نے ایڈیٹر کے نام خط لکھا ہے جس میں شمارہ کے بارے میں رائے اور ادبی کام کی اِس کاوش کو سراہا ہے۔ اشرف نقوی اِس شمارہ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ''یہ شمارہ اچھی اور معیاری نثری و شعری تخلیقات کا حسین گلدستہ ہے۔

ہفت روزہ ''نائب اللہ'' شیخوپور میں اشرف نقوی کی ایک غزل شائع ہوئی جس کے اشعار کچھ یوں ہیں:

ہم جو اپنی زمیں پہ زندہ ہیں
کس گمان و یقیں پہ زندہ ہیں
گم ہوئے ایسی حیرتوں میں ہم
اب جہاں ہیں ، وہیں پہ زندہ ہیں
حسرتِ دید ہے کہ مرتے نہیں
وعدۂ دل نشیں پہ زندہ ہیں

خواب جو آنکھ سے رہے اوجھل
وہ یقیناً کہیں پہ زندہ ہیں
کچھ تعلق ہے تیرے در سے اِنھیں
جو نشاں اِس جبیں پہ زندہ ہیں
کیا جیئیں گے مدار سے ہٹ کر
ہم تو اشرف یہیں پہ زندہ ہیں

4فروری2005ء کےنوائے وقت اخبار کے ادبی صفحہ پر اشرف نقوی کا ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان ''یادِ رفتگاں۔۔ پروفیسر خورشید حسین بخاری مرحوم'' تھا اس میں اشرف نقوی نے پروفیسر خورشید بخاری کے حالاتِ زندگی اور ادبی کاموں کے بارے میں ذکر کیا ہے۔نقوی صاحب پروفیسر خورشید بخاری کی شخصیت سے کافی متاثر ہیں۔اس بارے میں وہ اپنے جذبات کا اِظہار اِس طرح کرتے ہیں:

> ''پروفیسر خورشید حسین بخاری کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے۔وہ ایک معروف دانش ور، محقق، ادیب اور ماہرِ تعلیم ہی نہیں بلکہ اعلیٰ اوصاف سے متّصف ایک خوب صورت انسان بھی تھے۔''

اس کے بعد اُن کے ادبی ،تنقیدی اور تحقیقی کاموں کے بارے میں تفصیل لکھی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''پروفیسر صاحب کی مدوّن، ترجمہ شدہ اور تالیف شدہ کتابوں کی فہرست کافی طویل ہے جن کے نام درجِ ذیل ہیں:

1۔ کیمیائے سعادت (اُردو ترجمہ وانتخاب)
2۔ الکمال
3۔ مکتوباتِ امام ربانی (ترجمہ وانتخاب)

4۔ شعرائے فارسی کلاسیکی (انتخاب)

5۔ تذکرہ حضرت سیّد منظور حُسین شاہ

6۔ دیوانِ سیّد (مرتبہ)

7۔ گلستانِ سعدی (اُردو ترجمہ)

8۔ دِلّی کا آخری یادگار مشاعرہ (مرتبہ)

9۔ تذکرہ شیخ طاہر بندگی لاہوری

10۔ ترجمہ قصائدِ سعد سلمان لاہوری

11۔ قصائدِ عربی (ترجمہ و انتخاب)

12۔ قصائدِ خاقانی

وفات سے قبل وہ قادری سلسلے کے ایک بزرگ حضرت شاہ موسیٰ کے فارسی دیوان کی تدوین کر رہے تھے کہ موت نے اُنھیں اس کی مہلت نہ دی۔''

اشرف نقوی نے پروفیسر صاحب کے ایک ایک ادبی کام پر سیرِ حاصل بحث کی ہے اور ان کے تمام ادبی کارناموں کی تفصیل اپنے اس مضمون میں بیان کی ہے۔

اشرف نقوی شاعری کی طرح نثری تقاضوں سے بھرپور شناسائی رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین قاری کو با آسانی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ وہ الفاظ کا چناؤ ماہرانہ طریقے سے کرتے ہیں۔

25 اگست 2002ء کے ''خبریں'' اخبار میں ''خبریں فورم'' کے مشاعرے کی تفصیل بیان کی گئی ہے ہے جس میں دیگر شعراء کے ساتھ ساتھ اشرف نقوی نے بھی شرکت کی اور سامعین سے داد وصول کی۔ اُنھوں نے اپنی مندرجہ ذیل غزل پڑھی۔

میرے ہونے کی ہے موجود نشانی مجھ میں
روز لیتی ہے جنم کوئی کہانی مجھ میں
جانے کس رَو میں یونہی بہتا چلا جاتا ہوں
ایک مدت سے ہے دریا کی روانی مجھ میں

زیرِ آب آنے لگا دل کا علاقہ سارا
اِس قدر ٹپکا مِری آنکھ کا پانی مجھ میں
تیری خوشبو کی طلب میں یہ بدن چھوڑ دیا
اب مہکنا ہے تجھے رات کی رانی مجھ میں
لفظ در لفظ ہوں حیرت کا صحیفہ اشرفؔ
اور پوشیدہ ہے اِک بابِ معانی مجھ میں
(ص:۱۴)

روزنامہ ''جنگ'' کے یکم اکتوبر 1991ء کے ادبی ایڈیشن میں اشرف نقوی کی ایک غزل ''نئی آوازیں'' کے زیرِعنوان شائع ہوئی جس کا مقصد نئے لکھنے والوں کی شاعری کو قارئین کے سامنے لانا اور نئے شعراء کو پروموٹ کرنا تھا۔اشرف نقوی کے تین اشعار:

جب ہمیں معلوم ہے طارق نہیں ہم میں کوئی
کر لیے ہیں نذرِ آتش پھر سفینے کس لیے
سوچتا ہوں شہر کے غربت کدوں کو دیکھ کر
غم کے یہ کوچے بسائے آدمی نے کس لیے
یادِ ماضی ، عہدِ حاضر اور مستقبل کا خوف
تین ساتھی چُن لیے ہیں زندگی نے کس لیے

اشرف نقوی اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی تنظیم ''دریچہ'' کے جوائنٹ سیکرٹری بھی ہیں جس کے تحت وہ تواتر سے پندرہ روزہ اجلاس کا انعقاد کرواتے ہیں اور مشاعروں کا اہتمام بھی کرتے ہیں اور ان کی یہ ادبی مہم بڑے زور وشور سے جاری ہے۔شیخوپورہ اور مضافات سے تعلق رکھنے والے بہت سے شعرائے کرام ان مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کرتے ہیں۔اشرف نقوی کی غزل اور نثری تحریروں میں شاعرانہ بصیرت اور معاشرے کے اہم مسائل پر اُن کی گہری بصارت کی واضح جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

علمی وادبی تحریروں کے مجموعے ماہنامہ ''غنیمت'' لاہور میں اشرف نقوی کی ایک نظم شائع ہوئی جس کا عنوان تھا ''ناممکنات کے تعاقب میں۔''

ناممکنات کے تعاقب میں

بھٹک رہی ہیں ہماری آنکھیں
اِک ایسے منظر کی جستجو میں
جسے خدا نے ازل سے اب تک
کسی زمیں پر نہیں اُتارا
کسی خلا میں، کسی اُفق پر
کسی فلک پر نہیں اُتارا
مگر یہ آنکھیں
یہ پاگل آنکھیں
بس اپنی دُھن میں لگی ہوئی ہیں
بہت بلندی پہ اُڑ رہی ہیں
کہ منظرِ بے نشاں کو جیسے
خلا سے آگے تلاش لیں گی
مگر انھیں یہ خبر نہیں ہے
کہ چھوٹے چھوٹے پرندے اکثر
اِسی لگن میں
تھکن سے چُور اور نڈھال ہو کر
گِرے زمیں پر

یا پھر خلاؤں کی وسعتوں میں ہی کھو گئے ہیں
مگر یہ آنکھیں ۔۔۔۔۔۔۔ ہماری آنکھیں
بس اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہیں
سو اب اِن آنکھوں کو مشورہ ہے
کہ اپنی دھرتی کے منظروں پر
گزارہ کر لیں
بنالیں زخموں کو پھول
اشکوں کو جگنوں کر لیں ۔۔۔۔۔۔ ستارہ کر لیں
یہی زمینی حقیقتیں ہیں
کہ جن پہ چلنا ہی عصرِ حاضر میں لازمی ہے
مگر کریں کیا، ہماری آنکھیں
یہ پاگل آنکھیں
بس اپنی دُھن میں لگی ہوئی ہیں (ص:۲۲)

ماہنامہ ''غنیمت'' کے ایک اور شمارے میں اشرف نقوی کی ایک نظم شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے ''بے حسی۔'' اشرف نقوی کی نظم زندگی اور معاشرے کے تلخ حقائق سے پردہ اُٹھاتی نظر آتی ہے۔

بے حسی (نظم)

ایک مُدت سے زندگی کا سفر
کچھ رُکا سا، تھما تھما سا ہے
اور منظر تمام پیشِ نظر
حرکتِ زندگی سے عاری ہیں

سر پہ سورج تپش سے خالی ہے

چاند۔۔۔۔تاریکیوں میں ڈوبا ہوا

ایک شب۔۔۔۔اور وہ بھی اِتنی طویل

اِک صدی بھی ہے جس کے آگے قلیل

اب تو لگتی ہے کائنات مجھے

ایسا منظر کہ جس میں کچھ بھی نہیں

صرف اندھیرا ہے۔۔۔۔

اور اندھیرا ہے

میں بھی ایسا ہی ایک منظر ہوں

اپنی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا

ایک تصویر کی طرح ساکت

سوچ مفلوج، جذبے پژمُردہ

سانس گویا حلق میں اٹکی ہوئی

اور پہلو میں دل۔۔۔۔مگر پتھر

گویا پورا وجود ہی شل ہے

ایک منظر ہر ایک سمت رواں

ہر طرف ایک سی کہانی ہے

(ص:۲۱)

ماہنامہ ''سخن ور'' کراچی کے اپریل 2001ء کے شمارے میں اشرف نقوی کی غزل شائع ہوئی جس کے اشعار درج ذیل ہیں:

زخم در زخم ہے یادوں کا خزینہ دل میں
ہم نے آباد کیا ایک مدینہ دل میں
شام ہوتے ہی بھنور گھیرنے لگ جاتے ہیں
ڈوب جاتا ہے کسی شب کا سفینہ دل میں
روز اِس دشت میں کربل سی بپا ہوتی ہے
روز آتا ہے محرّم کا مہینہ دل میں
ہاں اِسی بزم میں امکاں تھا مِرے ہونے کا
جس کو برپا کیا تُو نے بھی کبھی نہ دل میں
آنکھ کی راہ سے آنے لگا باہر اشرف
وہ جو مدت سے تھا اشکوں کا دفینہ دل میں

ماہنامہ ''تخلیقات'' کے ستمبر 1999ء کے شمارے میں اشرف نقوی کی غزل شائع ہوئی۔ ان کی یہ غزل بہت سے رسائل اور جرائد میں شائع ہو چکی ہے۔

حصارِ ذات میں آیا ہوں اِس کمال کے ساتھ
بیان کرتا ہے مجھ کو جہاں مثال کے ساتھ
شفق کے رنگ میں سُرخی مِرے لہو کی ہے
میں جگمگاتا ہوں افلاک پر ہلال کے ساتھ
مجھے تو روز ہی یادوں کا رِزق ہونا ہے
کہ جُڑ گیا ہوں کسی خواب اور خیال کے ساتھ
گرا ضرور ہوں لیکن جُھکا نہیں ہوں میں
نہ دیکھو یارو! مجھے اِس قدر ملال کے ساتھ
ہمارے سر پہ یہ سورج جو دُھوپ تانتا ہے

تپش بھی بھیک میں دیتا ہے وہ جلال کے ساتھ
تمام عمر کیا خود کو حل مگر اشرف
جواب بن نہ سکا میں کبھی سوال کے ساتھ

ماہنامہ ''بیاض'' لاہور کے مئی 2010ء کے شمارہ میں اشرف نقوی کی دو غزلیں شائع ہوئیں جن میں سے چند اشعار درجِ ذیل ہیں:

اِک دیئے نے کہا ستارے سے
آ بچا لوں تجھے خسارے سے
ایک دریا تھا میں ، ندی بن کر
دُور ہوتا گیا کنارے سے
دل کی کٹیا کو لیپتے ہیں میاں!
ہم محبت کے مٹی گارے سے
شب تو کٹتی ہے آنکھوں آنکھوں میں
دن گزرتا نہیں گزارے سے
میری مٹی کو عشق نے اشرفؔ
جا ملایا ہے اِک ستارے سے

دوسری غزل کے اشعار درجِ ذیل ہیں:

اِتنا رویا جا سکتا ہے
شہر ڈبویا جا سکتا ہے
قطرہ قطرہ آنکھ میں بھر کر
دریا ڈھویا جا سکتا ہے
اپنی ذات میں پا کر اُس کو

خود کو کھویا جا سکتا ہے

جاگتی آنکھوں میں بھی اشرف

خواب سمویا جا سکتا ہے

ماہنامہ ''بیاض'' لاہور کے شمارہ اکتوبر 2004ء میں اشرف نقوی کی دو غزلیں چھپ چکی ہیں جن کے اشعار درج ذیل ہیں:

فکرِ موت و حیات میں گُم تھا

ہر بشر اپنی ذات میں گُم تھا

میرے چہرے سے بات کیا کرتا

آئینہ شش جہات میں گُم تھا

جس دیئے کو ہوا سے لڑنا تھا

وہ ہی خوفِ ممات میں گُم تھا

اُس کی آنکھوں میں ڈوب کر جانا

مَیں عبث کائنات میں گُم تھا

مجھ کو آسانیاں میسّر تھیں

دل مگر مشکلات میں گُم تھا

رات اشرف میں اک ستارے کی

جانے کن کن صفات میں گُم تھا

دوسری غزل اُنھوں نے جون ایلیا کی نذر کی ہے۔ جون ایلیا کی شاعری سے اشرف نقوی کافی حد تک متاثر نظر آتے ہیں۔

ذرا بھی دل میں وحشت ہے؟ نہیں تو

تو کیا راحت ہی راحت ہے؟ نہیں تو
بطورِ ہم سفر ، دل کے سفر میں
تجھے میری ضرورت ہے؟ نہیں تو
مجھے صحرا نے پھر آواز دی ہے
مِری مجنوں سی حالت ہے؟ نہیں تو
رہوں ہر حال میں مجبور و مفلس
یہ کیا رب کی مشیّت ہے؟ نہیں تو
سخن اشرف زباں پر آ گیا جو
اُسے کہنے کی ہمت ہے؟ نہیں تو

ہفت روزہ اخبار ''نائب اللہ'' شیخوپورہ کے ادبی صفحے ''گوشۂ علم واَدب'' میں اشرف نقوی نے ''اصغرعلی جاوید ہمہ جہت شخصیت'' کے عُنوان سے ایک مضمون تحریر کیا ہے جس میں اصغرعلی جاوید کی شخصیت، اُن کے ادبی کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ موصوف چونکہ اشرف نقوی کے محلہ دار بھی ہیں اس لیے وہ اُن سے گہری شناسائی رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اصغرعلی جاوید ایک اچھے کالم نگار، سیرت نگار اور ادیب ہیں۔ روزنامہ ''خبریں'' میں ان کا کالم تسلسل سے شائع ہوتا ہے۔ اُردو اور پنجابی کے علاوہ انگریزی پر بھی مکمل عبور رکھتے ہیں۔ اصغرعلی جاوید ایک اچھے ادیب ہی نہیں بلکہ ماہرِ قانون بھی ہیں اور لاہور کے ایک لاء کالج میں امریکی اور برطانوی آئین کے اُستاد کے طور پر بھی اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ واپڈا ہائیڈرو الیکٹرک لیبر یونین کے ریجنل صدر بھی ہیں۔ گویا وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔''

اصغرعلی جاوید کے ادبی کارناموں اور اسلوب کی بات کرتے ہوئے اشرف نقوی کہتے ہیں کہ:

''اصغرعلی جاوید اپنے تمام افسانوں میں قریب کی چیزوں کو اور بھی قریب کی چیزوں کو دیکھتے ہیں۔۔اصغرعلی جاوید اہلِ شیخو پورہ کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں اور اہلِ ادب کے لیے غنیمت کہ ادب کے فروغ میں ان کے شانہ بشانہ چلنے کے لیے ایک ساتھی میسّر ہے۔''

اشرف نقوی ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ مضمون نگاری میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی خاکہ نگاری بالکل اس طرح ہے جیسے کسی شخص کا پورا وجود ہماری نظروں کے سامنے پھر گیا ہو۔ اشرف نقوی نے جو مضامین لکھے ہیں وہ کچھ ایسے پورٹریٹ کیے ہیں جن سے متعلقہ شخصیت کا نہ صرف ظاہری پہلو سامنے آتا ہے بلکہ اُس کی ذات کے اندر کی بہت سی پرتیں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ وہ شخصیت کا نفسیاتی جائزہ بھی لیتے ہیں۔ اگر چہ ان کے قلم کی عادت ہے کہ وہ ہشت پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔شاید اِس لیے کہ وہ زیادہ تر مثبت پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اخبارات اور رسائل میں بھی دلگیر شخصیات پر تبصرہ نگاری کی ہے اور کچھ کی کتابوں کا تعارف بھی کرایا ہے۔

کسی بھی موضوع کو تحریر کرنے کے لیے انسانی مشاہدہ اِس معاملے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔لہٰذا قوتِ مشاہدہ کا وسیع اور گہرا ہونا ضروری ہے۔ ذرائع ابلاغ سے گہرا تعلق اور کتب و رسائل اور اخبارات کا مطالعہ ہونا ایک اہم امر مانا جاتا ہے۔صرف سُن لینا یا پڑھ لینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس پر دسترس حاصل کرنا صرف مشق سے ہی ممکن ہے۔ اِس لیے ضروری ہے کہ مختلف موضوعات پر وقتاً فوقتاً تحریر کرتے رہنا چاہیے۔

مضمون کے اختتام پر جب سمجھا جائے کہ اب اس پر مزید لکھنے کی گنجائش نہیں تو ازحد اہم پہلو ہے کہ مضمون پر نظر ثانی کی جائے اور الفاظ کی اصلاح و تصحیح کی جائے کیونکہ عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ صرف ونحو اور جملوں میں غلطیاں مضمون کی خوب صورتی کو ماند کر دیتی ہیں اور قاری کے تسلسل کو بے ربط اور بے مزا کر دیتی ہیں۔ مضمون نویسی کی صلاحیت گو کہ قدرتی خوبی ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ کچھ افراد اِس کمی کو بے حد محسوس کرتے ہیں۔ اگر کسی بھی کام کی مشق بار بار کی جائے تو ایسی کمی یا مشکل پر باآسانی قابو پایا جاسکتا ہے۔

اشرف نقوی نے غزل کے علاوہ حمد، نعت، منقبت اور نظمیں لکھی ہیں جو کہ تواتر کے ساتھ ادبی رسائل میں شائع ہو رہی ہیں۔ ماہنامہ ''صریر'' کراچی کے جون جولائی 1999ء کے شمارے میں اشرف نقوی کی غزل شائع ہوئی ہے جس کے اشعار درج ذیل ہیں:

سفر رُتوں میں مسافر کے سر پہ رکھتا ہے
جُھلستی دُھوپ کہ سورج جو تھر پہ رکھتا ہے
کبھی تو اُس کے لیے تم بھی مضطرب ہو گے
تمھاری آس پہ آنکھیں جو در پہ رکھتا ہے
وہ میرے سچ کو نہیں مانتا ہے سچ اشرفؔ
مگر بھروسہ وہ جھوٹی خبر پہ رکھتا ہے

اشرف نقوی نے شاعری کے ساتھ نثر میں بھی قلم کے بھرپور جوہر دکھائے ہیں۔ صحافت میں ایک اہم موضوع تبصرہ نویسی بھی ہے اور تبصرہ کسی مطبوعہ مواد کی ڈرامائی پیش کش نما نہیں یا اس طرح کے کئی اور واقعات یا موضوعات کے تجزیاتی یا تنقیدی جائزہ کا کام ہے جو عام طور پر کسی اخبار اور رِسالے میں طبع ہوتا ہے۔ اصغر علی جاوید پر جو تبصرہ انھوں نے لکھا ہے، اس میں ان کے ادبی اور علمی کارناموں کی تفصیل بیان کی ہے۔

اشرف نقوی کے مضامین میں جامعیت ہوتی ہے۔ ان کے مضامین کی قرأت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موضوع کے حوالے سے مجموعی جائزہ لیتے ہیں اور گہری ناقدانہ بصیرت اور دانشورانہ انداز اپناتے ہوئے کوشش کرتے ہیں کہ متعلقہ موضوع کی ہر جہت کو چُھوا جائے اور دلائل سے مربوط انداز سے بات کی جائے۔ ان کی تحریر مثبت اور معلوماتی ہونے کی وجہ سے قاری کی سوچ کو متحرک کرتی ہے اور ایسے پہلوؤں سے روشناس کراتی ہے جہاں اس کی نظر نہیں جاتی۔

ان کی تبصرہ نگاری میں مزاح کی چاشنی یا طنز کا جو رنگ ہے وہ بڑا دھیما اور ہلکا پُھلکا ہوتا ہے

اوراس مزاح اورطنز کی انفرادیت یہ ہے کہ اسے پیدا کرنے کے لیے قلم کار کوئی حربہ استعمال نہیں کرتا بلکہ باوصف عبارت کے باطن میں رواں دواں ہوتا ہے جو قاری کو مسکرانے پراُکساتا ہے۔طنز بھی اِس انداز سے کرتے ہیں کہ اس کا ہدف جھلاتا نہیں بلکہ خوب صورت وار سمجھ کر قبول بھی کرتا ہے اور سوچتا بھی ہے۔

اشرف نقوی باقاعدگی سے رسائل واخبارات میں لکھتے ہیں اور ادبی ایڈیشن میں ان کے مضامین ،نعت ،حمد،غزل،نظم اورمنقبت شائع ہوتی ہیں۔ وہ جن رسائل اور میگزین میں اپنا کلام شائع کرواتے ہیں اُن کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔	ماہنامہ ’’تخلیق‘‘ لاہور	مدیر: اظہر جاوید
۲۔	ماہنامہ ’’نیرنگِ خیال‘‘ راولپنڈی	مدیر: سلطان رشک
۳۔	ماہنامہ ’’غنیمت‘‘ لاہور رکراچی	مدیر: زمان کنجاہی راکرم کنجاہی
۴۔	ماہنامہ ’’ادب دوست‘‘ لاہور	مدیر: خالد تاج
۵۔	کالج میگزین ’’ورثہ‘‘ گورنمنٹ وارث شاہ ڈگری کالج جنڈیالہ شیر خان شیخوپورہ	
۶۔	ماہنامہ ’’سخنور‘‘ کراچی	مدیر: نقوش نقوی
۷۔	سہ ماہی ’’گردش‘‘ ٹنڈوآدم	مدیر: غلام مرتضیٰ چشتی
۸۔	ماہنامہ ’’فرسٹ آپشن‘‘ لاہور رگوجرانوالہ	مدیر: وحید احمد زمان ر یاسمین سحر
۹۔	ہفت روزہ ’’نائب اللہ‘‘ شیخوپورہ	مدیر اعلیٰ: اسد علی خاں
۱۰۔	ماہنامہ ’’دُنیائے ادب‘‘ کراچی	مدیر: اوجِ کمال
۱۱۔	ماہنامہ ’’کینوس‘‘ کراچی	مدیر سیّد فہیم الدین
۱۲۔	ماہنامہ ’’بیاض‘‘ لاہور	مدیر: خالد احمد
۱۳۔	پندرہ روزہ ’’روشنی‘‘ پشاور	مدیر: سکندر حیات قلندر

۱۴۔ ماہنامہ ’’تخلیقات‘‘ شیخوپورہ مدیر: کریم الدین خلجی

۱۵۔ سہ ماہی ’’برگِ نو‘‘ ڈیرہ اسمٰعیل خان مدیر: نور احمد نازؔ

۱۶۔ ماہنامہ ’’کاغذی پیرہن‘‘ لاہور مدیر: شاہد شیدائی

۱۷۔ کتابی سلسلہ ’’نزول‘‘ گوجرہ سیّد اذلان شاہ

۱۸۔ ماہنامہ ’’فانوس‘‘ لاہور مدیر: خالد علیم / بانی قدیر شیدائی

۱۹۔ سہ ماہی ’’کارواں‘‘ بہاول پور مدیر: نوید صادق، بانی: سیّد آلِ احمد

۲۰۔ ماہنامہ ’’حُسنِ بیاں‘‘ کراچی مدیر: مزمل علی

۲۱۔ ’’عکاس‘‘ انٹرنیشنل، اسلام آباد مدیر: ارشد خالد

۲۲۔ ’’ادب و ثقافت‘‘ انٹرنیشنل مدیر: شکیل سروش

۲۳۔ سہ ماہی ’’ادبیات‘‘ اسلام آباد مدیر: نگہت سلیم

۲۴۔ سہ ماہی جمالیات‘‘ اٹک مدیر: طاہر اسیر، حسین امجد

۲۵۔ ادبی سلسلہ ’’زربفت‘‘ نارووال مدیر: سرور ارمان

۲۶۔ آٹھ بحرِ سخن (انتخاب شاعری) مرتب: اکمل شاکر

۲۷۔ روزنامہ ’’نوائے وقت‘‘ لاہور ادبی ایڈیشن

۲۸۔ روزنامہ ’’نئی بات‘‘ لاہور چیف ایڈیٹر چوہدری عبدالرحمٰن

۲۹۔ سہ ماہی ’’تجدیدِ نَو‘‘ لاہور مدیران: عذرا اصغر، شبہ طراز

۳۰۔ سہ ماہی ’’اِدراک‘‘ گوجرانوالہ مدیر: خالد فتح محمد

۳۱۔ ماہنامہ ’’شام و سحر‘‘ لاہور مدیر: شیخ صفدر علی، ڈاکٹر شبیہ الحسن

۳۲۔ پندرہ روزہ ’’نعرۂ حق‘‘ شیخوپورہ مدیر: اسد علی خان

ماہنامہ ''تخلیقات'' میں حیاتِ قائدِ اعظم کے چند اوراق'' کے نام سے ایک مضمون لکھا ہے ۔ یہ بڑا منفرد ادب پارہ ہے جسے پڑھ کر ایک عام قاری کے ذہن میں یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ جیسے اشرف نقوی نے عالمِ خواب میں حضرت قائدِ اعظم کو رُو برو پا کر اُن سے سیاسی، سماجی نا گفتہ بہ ملکی حالات پر مکالمہ کیا ہو اور پھر بیدار ہونے پر اپنی فہمیدہ یادداشت کے توسّل سے اسے صفحۂ قرطاس پر رقم کر دیا ہو، کیونکہ اس مضمون میں اشرف نقوی نے تحریکِ پاکستان میں کی جانے والی کوشش پر سیرِ حاصل گفتگو کی ہے۔ دوسرا تاثر جو کہ مبنی بر حقیقت ہے، وہ یہ کہ پہلے سے موجود مختلف مقامات اور جلسوں میں بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناح کے ارشادات، مظاہرات اور فرمودات کو بڑی مہارت اور وجدانی کیفیات سے ترتیب دے کر اُن کی شخصیت کا خاکہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اُن کی ذاتی اور سیاسی زندگی کے پوشیدہ پہلوؤں کو عیاں کر دیا ہے۔

اشرف نقوی نے غزل کے علاوہ حمد و نعت، سلام و منقبت میں بھی اپنے قلم کے جادو چلائے ہیں ۔ ان کی بیشتر شاعری میں ''کربلا'' استعارہ رہا ہے جو اپنی صناعی کے لحاظ سے ہر شعر میں مختلف ہے۔ اُن کی ایک غزل اس کی ترجمانی کرتی ہے کہ وہ زندگی کے موجودہ حالات و واقعات کو کربلا سے تشبیہ دیتے ہیں۔ آج بھی وقت کے یزید موجود ہیں۔ آج بھی حق و باطل کے مابین جنگ جاری ہے۔ باطل آج بھی غالب ہے اور حق کو دبایا جا رہا ہے۔ ان کے اشعار ملاحظہ ہوں:

حق کے لیے یوں جان سے جانا پڑا مجھے
اپنے لہو میں آپ نہانا پڑا مجھے
ہر دَور میں یزید مقابل رہا مِرے
ہر بار کربلا کو سجانا پڑا مجھے

اشرف نقوی اس سے آگے یہ کہتے ہیں کہ کسی کی یاد میں گھلنے کے لیے مجھے شمع بن کر خود کو جلانا پڑا۔ ساری زندگی اس بے نام سہارے کی تلاش میں رہا جس کا پتہ مجھے آج تک نہ چل سکا۔

پوچھی کسی نے میری حقیقت اگر کبھی
پانی پہ اپنا نقش بنانا پڑا مجھے
اشرف برائے روشنی ، دُنیا کے سامنے
اپنا بجھا چراغ جلانا پڑا مجھے

حق و باطل کے درمیاں ہمیشہ جنگ ہوتی رہے گی۔ جو حُسینی ہوگا وہ باطل کے خلاف آواز بلند کرے گا چاہے کسی بھی تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔ ماہنامہ ''سخنور'' کراچی میں اشرف نقوی کی نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم شائع ہوئی جس میں اُنھوں نے مدحتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بیان کی ہے۔ نعت گوئی کا فن اشرف نقوی کے ہاں بہت عمدگی سے برتا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پکار کے اُن سے التجا کر رہے ہیں کہ جس اُسوۂ حسنہ پر چلنے کا آپؐ نے درس دیا، مجھے بھی وہ اُسوہ عطا کر دیں۔ وہ تاریکیوں کو ختم کر کے روشنی کا دِیا دِکھا دیں۔ بھٹکے ہوؤں کو آپؐ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اپنے روضے پر بلانے کے حوالے سے وہ اس طرح التجا کرتے ہیں:

گِھرا ہوں ظلمتِ عصیاں میں ، روشنی دے دو
شعور جس میں ہو ، احساسِ زندگی دے دو
مِرے وجود کے تپتے جُھلستے صحرا کو
ہوا بہار کی ، گلشن کی تازگی دے دو
ہوا کے ہاتھ جو بھیجوں درود نذرانہ
یہ التجا ہے اسے اِذنِ حاضری دے دو
دیارِ جاں کو ضرورت ہے رہنمائی کی
بھٹک گئے ہیں خیالات ، رہبری دے دو
نہ چاہوں دولتِ دُنیا ، نہ باغ جنت کے

مجھے تو آقاؐ فقط اپنی ہم رہی دے دو
یہ بے زبان سا عجمی غلام ہے اشرفؔ
عرب کے شاہا! اِسے بھی سخنوری دے دو

ماہنامہ ''نیرنگِ خیال'' دسمبر 2008ء میں اشرف نقوی کی دو غزلیں شائع ہوئی ہیں:

جس دن سے وفاؤں کے طلب گار ہوئے ہم
اپنے ہی لیے باعثِ آزار ہوئے ہم
اِک دشت سے اِس دل کو جُدا کرنے کی دُھن میں
دیوار اُٹھاتے ہوئے دیوار ہوئے ہم
اعزاز یہ ایسے ہی نہیں مل گیا صاحب!
کٹوائے ہیں بازو تو علم دار ہوئے ہم
اے دستِ ہُنر تیرا ہی اعجاز ہے شاید
بننے بھی نہیں پائے کہ مسمار ہوئے ہم
اِک عمر تلک ہم نے لکھے اپنے قصیدے
اِک عمر کے بعد اپنے عزا دار ہوئے ہم
رہ رہ کے تکا کرتی ہیں اِک شخص کی جانب
یونہی نہیں آنکھوں پہ نگہدار ہوئے ہم
اشرفؔ نہیں راس آئی تمنّا کی اسیری
ہر بار مگر پھر بھی گرفتار ہوئے ہم

اشرف نقوی اِس دور میں وفا دار لوگوں کو تلاشنے کی کھوج میں ہیں مگر لوگوں میں وفا برائے نام باقی رہ گئی ہے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں محرومی اور یاسیت کو ظاہر کیا ہے اور بہت خوب صورتی

سے ردیف قافیہ کا استعمال کیا ہے۔(ص:۲۸)اِسی صفحہ پر ایک اور غزل ہے:

مجھ کو مِرے وجود سے باہر نکال کے
رکھنے لگا وہ دیکھیے ، مجھ کو سنبھال کے

معیارِ دوستی ہی نہیں سخت کُچھ مِرا
کرتا ہوں دُشمنی بھی بہت دیکھ بھال کے

اندازہ کچھ نہیں تھا مجھ اُس کی پیاس کا
پچھتا رہا ہوں دشت میں دریا کو ڈال کے

کرنے لگے ہو چارہ گرو! سعیِ رائیگاں
عادی ہمارے زخم نہیں اندمال کے

اِک آئینہ تھا ، ٹوٹ کے کب کا بکھر چکا
اب رکھنے آئے ہو مجھے یارو سنبھال کے

تم خواب جس کو کہتے ہو ، ہے خواب کب میاں!
اِک روگ ہے جو رکھا ہے آنکھوں نے پال کے

❁❁❁❁❁

حوالہ جات

۱)۔ اشرف نقوی، ’’حیاتِ قائدِ اعظم کے چند اوراق، ماہنامہ ’’تخلیقات‘‘ شیخوپورہ، ستمبر ۱۹۹۹ء، ص:۵

۲)۔ اشرف نقوی، ’’خاکہ مستی‘‘، سہ ماہی کارواں، بہاول پور، جنوری تا مارچ، ۲۰۱۰ء صفحہ ۴۷

۳)۔ اشرف نقوی، ’’شاہین عباس اور خدا کے دن‘‘، سہ ماہی ’’کارواں‘‘ بہاولپور، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۱ء، ص ۶۲

۴)۔ اشرف نقوی، ’’اے چارہ ساز و‘‘ سہ ماہی ’’کارواں‘‘ بہاولپور، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۱ء، صفحہ ۵۴

۵)۔ اشرف نقوی، ’’پانیوں سے الگ‘‘، عکاس انٹرنیشنل، اسلام آباد، کتاب نمبر ۲۶، مئی ۲۰۱۷ء، صفحہ ۹۲

۶)۔ اشرف نقوی، نعتِ رسولِ مقبولؐ، پندرہ روزہ ’’روشنی‘‘ پشاور، یکم تا ۳۰ ستمبر ۲۰۰۲ء، ص ۴

۷)۔ اشرف نقوی، ’’خواب دیکھے بِنا تعبیر سے بندھ کر بیٹھا‘‘، ’’عالمی رنگِ ادب‘‘ کراچی، سلسلہ ۳۰، ۳۱، صفحہ ۳۷

۸)۔ اشرف نقوی، ’’سوائے اِس کے مری داستان کوئی نہیں‘‘، عالمی رنگِ ادب، صفحہ ۳۸

۹)۔ اشرف نقوی، ’’یادِ رفتگاں‘‘، روزنامہ نوائے وقت‘‘ لاہور، ۶ فروری ۲۰۰۵ء، ادبی صفحہ

۱۰)۔ اشرف نقوی، ’’میرے ہونے کی ہے موجود نشانی مجھ میں‘‘، روزنامہ خبریں، لاہور، ۲۵ اگست ۲۰۰۲ء، صفحہ ۱۴

۱۱)۔ اشرف نقوی، ’’ناممکنات کے تعاقب میں‘‘، ماہنامہ ’’بیاض‘‘ لاہور، شمارہ نمبر ۳، مارچ س ن، ص ۱۰۸

۱۲)۔ اشرف نقوی، ’’بے حسی‘‘ ماہنامہ غنیمت‘‘ لاہور، جولائی، اگست ۲۰۰۲ء، صفحہ ۲۱

۱۳)۔ اشرف نقوی، ’’اصغر علی جاوید ہمہ جہت ادیب‘‘، ہفت روزہ نائب اللہ شیخوپورہ (اخبار) س ن

۱۴)۔ اشرف نقوی، ’’خواب سرا اور عصری شعور‘‘، ہفت روزہ اخبار نائب اللہ، شیخوپورہ، ۲۰ تا ۲۶ نومبر ۲۰۰۶ء

باب نمبر ۵

اشرف نقوی کا ادبی مقام

اشرف نقوی نے نہایت کم عرصہ میں اپنا ایک منفرد اور الگ ادبی مقام بنایا ہے۔ ادبی حلقوں میں ان کے کام کو سراہا جارہا ہے۔ ان کی تحریروں اور شاعری کا مزاج دوسرے شعراء سے جدا اور منفرد ہے۔ اُن کی شاعرانہ بصیرت اور معاشرے کے اہم مسائل پر اُن کی گہری بصارت کی واضح جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

اشرف نقوی کے کے دو مجموعے اب تک منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور تیسرا ابھی تکمیل کے مراحل میں ہے۔ اشرف نقوی کے ان مجموعوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ادبی حلقوں میں اُن کا مقام و مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔

امجد اسلام امجد اِس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''غزل شاید اُردو ادب کی واحد صنفِ سخن ہے جو جس قدر خوب صورت ہے اس سے زیادہ خوش بخت ہے کہ گزشتہ تین سو برس میں شاید ہی کوئی ایسا زمانہ ہو جب اس میں تازہ اور صحت مند خون کی آمد کا تسلسل ٹوٹا ہو۔ اس کی ایک زندہ مثال اشرف نقوی کا یہ مجموعۂ کلام ہے۔''

اُردو شاعری میں اپنے فن کی بدولت اشرف نقوی نے بہت اونچا مقام و مرتبہ حاصل کیا۔ اُنھوں نے مروّجہ زبان کے دائرہ میں رہتے ہوئے شعری اظہار میں خوش گوار جدت پسندی کا مظاہرہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ شاعری کو لطیف احساسات کے تار سے جوڑنا چاہتے ہیں۔ اشرف نقوی یقینی طور پر ایک دل نشیں اور مؤثر شعری قوت کے مالک ہیں اور یہ وہ منزل ہے جس تک ہر عہد میں بہت کم شعراء کی رسائی ممکن ہو پاتی ہے۔

اشرف نقوی کی غزل نے آس پاس پھیلے ہوئے جدت برائے جدت کے پینتروں اور

تجریدیت نشریت کے سوانگوں پر بھرپور فتح حاصل کی۔ ان کے ہاں زندگی کے معمولی سے معمولی مظہر تک کو محسوس کرنے کا رویّہ ملتا ہے جو اُن کے ہاں خوب صورت تشبیہات اور استعارات میں ڈھل کر قاری کے متخیلہ کو ہی نہیں اس کے سارے حسّی نظام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

مجھ کو مِرے وجود سے باہر نکال کے
رکھنے لگا وہ دیکھیے مجھ کو سنبھال کے
معیارِ دوستی ہی نہیں سخت کچھ مِرا
کرتا ہوں دُشمنی بھی بہت دیکھ بھال کے

کسی بھی نوجوان شاعر سے یہ توقع رکھنا کہ اس کا سارا تخلیقی جوہر ابتداء ہی میں اپنے امکانات کو تفصیل سے ظاہر کر دے گا، ایک خلافِ عقل بات ہے کہ فنکار کا تخلیقی ارتقاء وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف نئے امکانات دریافت کرتا ہے بلکہ اپنے مخصوص لہجے اور طرزِ فکر کی تعمیر بھی کرتا ہے۔ اشرف نقوی بھی ہر اچھے اور فطری شاعر کی طرح امتحان سے گزرے ہیں۔ جو چیز انھیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کر رہی ہے وہ ان کی اُٹھان کا انداز ہے۔

میرے ہونے کی ہے موجود نشانی مجھ میں
روز لیتی ہے جنم کوئی کہانی مجھ میں
جانے کس رَو میں یونہی بہتا چلا جاتا ہوں
ایک مدت سے ہے دریا کی روانی مجھ میں

ہم نئی صدی میں غزل جیسی نازک صنف کی بات کرتے ہیں تو موجودہ صورتِ حال کو بھی پیشِ نظر رکھنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ موجودہ صدی کے آغاز ہی سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی روز افزوں ترقی نے پورے عالمی معاشرے کو ایک تیز رفتار تغیّر سے دو چار کر دیا۔ نئی صدی کا سورج طلوع تو ہوا مگر سیاسی، سماجی، مذہبی، تہذیبی، اقتصادی اور معاشی اتھل پتھل شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے قدروں کے پیمانے اور مسائلِ زندگانی کی کیفیتیں اور صورتیں بدل گئیں۔ زندگی کا سیلِ رواں آئندہ

کس رنگ روپ میں ڈھلے گا؟ کیا اسے ایک صورت ملے گی اور اِسے کبھی قرار بھی نصیب ہوگا؟ کہنا مشکل ہے۔

نوّے کی دَہائی کے بعد دُنیا کی معیشت پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کے کنٹرول کے بعد نئے نظامِ زر کا شکنجہ کسا جا چکا ہے۔ فرد اور جماعت کی ہر ایک قدر سرمایہ اور صارفیت کی بھینٹ چڑھ گئی۔ زندگی مادی، روحانی اور عمرانی نقطۂ نظر سے ایک عجیب وغریب اضطراب و انتشار کا شکار ہے۔ ہر طرف ایک عام نا آسودگی، نارسائی، رشتوں کی شکست و ریخت اور محرومی کا احساس طاری ہے اور ہر جگہ ایک بے یقینی، بے چینی، بے چہرگی اور بے اطمینانی کی کیفیت ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکہ کی قیادت میں ہر اعتبار سے مغرب کی یلغار ایسی منظم، غیر محسوس اور گہری رہی ہے کہ مشرق کی تمام تر تمدنی قدریں اس کے زیرِ اثر تلملا کر رہ گئی ہیں۔ ہر طرف اپنی بے بسی اور لاچاری کا رونا ہے۔

دورِ حاضر کے شاعر کی بات کریں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ آج کا شاعر اپنے عہد اور عہد کے مسائل سے واقف ہے۔ وہ سائنس، ٹیکنالوجی، گلوبلائزیشن، صارفیت، سرمایہ داری، سیاست، تشدّد، تعصّب، بھرشٹاچار، نیاعریاں کلچر، فرقہ وارانہ فسادات، عوام میں بڑھتی ہوئی فرسٹریشن، اقدار کی پامالی، ہماری گمشدہ تہذیب، میڈیا کی کارستانیاں، ملک کی مخصوص سیاست، ہوس کی اجارہ داری، انسان کی نفسیاتی کمزوریاں، زندگی کی اُلجھنیں، دہشت گردی، انٹرنیٹ، سائبر اسپیس، کلوننگ، سروگیسی، روبوٹ، ایٹمی اور نیوکلیائی تجربات اس پر مستزاد، عالمی سماج پر ایک نئے عالمی نظام کی مضبوط گرفت، عدم تحفّظ اور عالمی نظام کے درہم برہم وغیرہ کا علم رکھتا ہے۔

موجودہ حالات میں اشرف نقوی کو مسائل کا حقیقی عرفان و اِدراک ہے۔ اسے تبدیل شدہ افکار و اقدار کا حقیقت پسندانہ و فنکارانہ اظہار و ابلاغ کا ہُنر آتا ہے۔ اس کے لیے حِسّی اور جذباتی نشیب و فراز قصۂ پارینہ ہیں۔ اس کی شاعری اپنے حِسّی تجربات کی زائیدہ ہے۔ وہ اپنے پیش رووَں کی اندھی تقلید کرنا بھی نہیں چاہتا۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہے کہ ناقدینِ ادب اس کی

شاعری کو شاعری قرار دیں گے یا نہیں۔ وہ کسی کے بندھے ٹکے اصولوں کے تحت شعر کہنا پسند نہیں کرتا۔ وہ آزاد ہے اور آزادی چاہتا ہے۔

نہ راس آیا زمیں سا جو خاک دان مجھے
لگا بُلانے اِشاروں سے آسمان مجھے
مَیں اپنے عہد کی آواز بننے والا تھا
پہ مصلحت نے مِری رکھا بے زبان مجھے

اشرف نقوی ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت، تشکیلیات، ساختیات و پسِ ساختیات جیسی اصطلاحات سے اُلجھنے کی بجائے خود کو الگ اور تنہا محسوس کرتا ہے اور کسی ایک مخصوص نظریے، فکر، رجحان یا تحریک سے وابستہ رہ کر خود کو مقیّد نہیں کرنا چاہتا اور کسی ایک ''اِزم'' سے وابستہ نہیں ہوتا۔ ہم اِس آزادانہ رہروی کو راہِ فرار نہیں قرار دے سکتے۔

تُو حقیقت ہے یا خیال ابھی
بوجھ دل پر ہے یہ سوال ابھی
میں کہ گم ہوں خود اپنی حیرت میں
مجھ کو مشکل میں تُو نہ ڈال ابھی

اشرف نقوی کے بارے میں اظہر عباس اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شاعری کے اِس حبس زدہ ماحول میں اشرف نقوی تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند اپنے مجموعۂ کلام ''آخرش'' کے ساتھ نمودار ہو کر ہماری تشنگی کو کافی حد تک کم کرنے میں کامیاب ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ میری نظر میں اچھی شاعری کی صرف اتنی ہی پہچان ہے کہ جسے پڑھیں تو بار بار پڑھنے کو دل چاہے اور میں بلا مبالغہ اس کتاب کو پانچ سے چھ بار پڑھ چکا ہوں۔ ہر بار پڑھنے کے بعد کسی نئے ذائقے سے روشناس ہوا ہوں۔ اس شعری مجموعے میں بہت سے خوب صورت اور چمکیلے اشعار جگہ جگہ اپنے قاری کو رُک نے پر مجبور کرتے ہیں۔''

اُردو ادب کے میدان میں اشرف نقوی اپنا سفر خود طے کر رہا ہے اور اپنا وجود منوانے کی کوشش میں لگا ہے۔ وہ زندگی سے اپنا رشتہ قائم کرنے میں جٹا ہوا ہے۔ وہ اپنی ذات کی گمشدگی اور خود کلامی سے زیادہ زندگی کے اثبات اور اس سے مکالمہ کا رویہ پیدا کرنے کی کوشش میں ہے۔ اسے زندگی کا درک اور شدید احساس ہے۔ زندگی کا یہ ادراک و احساس اس کی ذات کے حوالے سے شاعری کا جزو بن گیا اور زندگی سے متعلق جو رویہ اختیار کیا گیا، وہ ترقی پسندی اور جدیدیت سے یکسر مختلف، منفرد اور جداگانہ ہے۔

کیفیت ہے یہ جسم و جان میں کیا
کوئی آیا ہے اِس مکان میں کیا
دھوپ میں تم جو بھاگے پھرتے ہو
چھاؤں ڈستی ہے سائبان میں کیا

اشرف نقوی کے شعری مجموعے ''زادِ حرف'' کے حوالے سے اظہر عباس مزید لکھتے ہیں:

''شاعری کی کسی ایک کتاب پر مضمون لکھنے کے لیے الگ سے ایک کتاب کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ مضمون پوری کتاب پر بات کرنے کے لیے کم ہوتا ہے اور اشرف نقوی کی ''زادِ حرف'' تو یوں بھی کئی رنگوں سے مزیّن ہے اور سارے رنگوں پر بات کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا۔''

اظہر عباس اپنے اس پورے تبصرے میں اشرف نقوی کے دَورِ ہجر کی بہت زیادہ بات کرتے ہیں مگر اشرف نقوی اپنے اِس ہجر کی داستاں کو چھپاتے ہیں کیونکہ وہ خاموشی میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ بقول ناصرؔ کاظمی:

جدا ہوئے ہیں بہت لوگ ، ایک تم بھی سہی
اب اِتنی بات پہ کیا زندگی حرام کریں

اب اشرف نقوی کا انداز دیکھیے:

شامِ وصال میرے مقدّر میں تھی مگر
اِک ہجر اپنے نام کیا اور چپ رہا

عطاءالحق قاسمی اشرف نقوی کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

''اِن دِنوں شہرِ ادب میں جس طرف نظر اُٹھایئے، شعراء کا ایک ہجوم نظر آتا ہے یعنی ''ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں'' والا معاملہ ہے۔ ان میں اکثریت تو اُن شعراء کی ہے جو شاعری کا مستقبل مخدوش بنانے کے لیے اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہیں، مگر صورتِ حال اِتنی بھی مایوس کُن نہیں کہ شاعری سے مُنہ موڑ لیا جائے۔ اِس بھیڑ میں بھی کبھی کبھی کوئی آواز ایسی ہوتی ہے جس کو سُننے کو جی چاہتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا کلام بھی سامنے آتا ہے جس کو پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

شعراء کے اِس قبیلے کا ایک فرد اشرف نقوی ہے۔ اشرف نقوی کی شاعری پڑھتے ہوئے پہلے تو آپ چونکتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ مسحور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس کا روایتی ڈکشن پس منظر میں رہتا ہے اور اُس کا جدید طرزِ احساس اُس کے جذبے اور خلوص کے ساتھ آمیز ہو کر قاری کے دل میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ وہ محبت کی شاعری بھی کرتا ہے تو یوں کہ محبت کی شاعری کرنے والوں میں نمایاں نظر آنے لگتا ہے۔ اگر وہ اِسی سنجیدگی اور مستقل مزاجی سے اپنا شعری سفر جاری رکھے تو بہت جلد وہ اہم شعراء کی صف میں شامل ہو سکتا ہے۔''

(۲۴اپریل۲۰۰۶ء)

شاہین عباس اِس حوالے سے لکھتے ہیں:

''اشرف نقوی کی غزل ایک طرف قدامت اور اس کے اسرار کا بیانیہ ہے اور دوسری طرف جدت اور اس کے فشار کی کہانی۔ ضروری نہیں کہ شاعر اور اُس کے قاری کے مابین تعلق فکری مناسبتوں سے ہی استوار ہو۔ قاری اور شاعر مختلف و متصادم منطقوں میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں اور مکالمہ کر سکتے ہیں۔ اشرف نقوی کی بطور شاعر اپنے عصر سے مزاحمت اس کے اشعار میں جا بجا دِکھائی دیتی ہے جس کا اگلا مرحلہ

متوقع طور پر تصادم بھی ہوسکتا ہے۔طبیعات و مابعد الطبیعات کے دوراہے پر شخصیت کے ظاہر و باطن میں ہوتا ہوا آج کے انسان کا فرسودہ از کارِ رفتہ طرزِ سخن سے تصادم۔''

ڈاکٹر خالد ندیم شاعر کے بارے میں رائے دیتے ہیں:

''اشرف نقوی کی شاعری ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے فنی پختگی کی منزل تک آ گئی ہے۔ان کے اشعار دل و دماغ کے تاروں کو چھو کر گزرتے ہیں اور پھر دیر تک فکر و خیال کی لہروں میں ارتعاش رہتا ہے۔اشرف نقوی اُردو شاعری کے مستقبل کی نوید بھی ہیں اور شاعری کی بقاء کے ضامن بھی۔''

نعیم گیلانی لکھتے ہیں:

''فکری اور فنّی اعتبار سے اشرف نقوی کی غزل عصری منظر نامے میں نہ صرف معروف و مقبول ہے بلکہ پورے وجود کے ساتھ اپنے ہونے کی گواہی بھی ہے۔''زادِ حرف'' کی شعریات میں جس ہُنر مندی کے ساتھ تخیل اور تجربے کی صورت گری کی گئی ہے وہ انھیں نہ صرف معاصرین بلکہ بزمِ آئندگان میں بھی ممتاز نشست پر براجمان رکھے گی۔''

روز نامہ'' آغازِ سفر'' ملتان کے ایڈیٹر نازش آصف اور کالم نگار قاسم سہانی نے 12 جولائی 2015ء کے ادبی کالم میں اشرف نقوی کے شعری مجموعوں کے حوالے سے بات کی۔وہ کہتے ہیں:

''پیشے کے لحاظ سے اشرف نقوی اُستاد ہیں مگر خود کو ادب کا طالب علم سمجھتے ہیں۔شیخو پورہ پریس کلب کی جانب سے شاعرِ مشرق ایوارڈ، کئی یادگاری شیلڈیں، یادگار مشاعرے، نامور شعراء کے ساتھ مشاعرے پڑھنا اشرف نقوی کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔''

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''اشرف نقوی نے اپنی شاعری میں ثابت کر دیا کہ شاعر اور اس کا قاری مختلف فکری منطقوں میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے قریب آ سکتے ہیں۔اشرف نقوی مکمل طور پر ادبی رموز کو سمجھتے ہوئے بھی سرائیکی زبان کے صوفی شاعر حضرت خواجہ غلام فریدؒ کے اِس شعر کی لائن پر کاربند ہے:

بھک نہ بہہ تاں یار فریدا!

نت یار داد میرا پرے توں پرے

اشرف نقوی کا شعر دیکھیں:

خاک سے خاک ملنے کو بے تاب ہے
اب نہ کرنا مِرے خاک داں معذرت

اگر شاعر اور دانش ور ایمان داری سے سچ لکھنا شروع کر دیں تو اشرف نقوی کے اِس شعر کی بھرپور تائید ہوگی:

ہم وقت کے سرمد بھی ہیں ، منصور بھی اشرف
گونجے گی ہر اِک دَور میں آواز ہماری

روز نامہ ''جناح'' لاہور کے 2 جون 2012ء کے شمارے میں اشرف نقوی کا ایک انٹرویو شائع ہوا۔ انٹرویو لینے والے مظفر علی خان ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے پیشِ نظر اخبارات و رسائل میں ان کی شاعری شائع ہو رہی ہے۔

ہفت روزہ ''نائب اللہ'' شیخوپورہ کے 27 نومبر تا 10 دسمبر 2006ء کے شمارے میں اشرف نقوی کے شعری مجموعے ''آخرش'' کی تقریبِ رونمائی کی رپورٹ شائع ہوئی جس کے مطابق تقریب میں بہت سے معروف شعرائے کرام نے شرکت کی اور اشرف نقوی اور ان کی شاعری کے بارے میں اظہارِ خیال کیا۔ صدرِ مجلس سرور ارمانؔ نے کہا کہ:

''شاعر کے ہاں رومانوی نَے بلند ہونے کے باوجود اپنے عہد کے مسائل اور عصری آشوب کی جھلک نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ شاعر کے ہاں اپنی شاندار روایت کا شعور اور جدید حسیت دونوں موجود ہیں۔ میں اِس خوب صورت مجموعے کی اشاعت پر انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔''

ارشد نعیم نے کہا کہ:

''صفحۂ قرطاس پر اُترتے ہی بڑے بڑے شعراء کی شاعری زندگی کھو بیٹھتی ہے اور شاعر کا سانس پھول جاتا ہے۔ اشرف نقوی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان کی شاعری کاغذ پر

ہمیشہ خود کو منوانے میں کامیاب ٹھہری ہے۔‘‘

ڈاکٹر شاہد مسعود ہاشمی نے کہا کہ ’’اشرف نقوی کی شاعری میں اچھی شاعری کے جملہ محاسن موجود ہیں۔ ابرار حامد نے شاعر کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ایک مشکل زمین کا انتخاب کیا اور اس کو آخر تک خوب نبھایا۔ شارق نظامی نے اپنے مضمون میں اُردو غزل کی تاریخ اور تحریکات کو بنیاد بناتے ہوئے اشرف نقوی کی شاعری پر مضمون پیش کیا جسے سراہا گیا۔

محمود اختر خان اشرف نقوی کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

’’اشرف نقوی کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ میرے ساتھ قارئینِ ادب کو بھی میرؔ صاحب کی شعری نگری میں لے گئے اور میرؔ کے سکول سے بھی شناسائی دی اور میرؔ صاحب کی شعری عظمت سے استفادے کو بھی ظاہر کیا۔ میرؔ صاحب کے حوالے سے مرزا غالب، ابراہیم ذوق، حسرت موہانی، مخدوم غفور ستاری اور ظریف احسن کے اشعار کا مطالعہ کرایا۔ لہٰذا اس شعری فضا کے تسلسل میں اشرف نقوی کے کچھ اشعار دیکھتے ہیں:

رَہِ سُخن میں نئی منزلیں دِکھانے کو
یہ میرا دل ، یہ مِرا رہ نما سلامت ہے

وہ ستارہ بھٹک نہیں سکتا
جس ستارے کے رہنما ہیں ہم

اشرف نقوی کی ادبی حیثیت کو ’’آخرش‘‘ نے نمایاں کیا ہے۔ اس نے بنے بنائے مقام کو کئی رُتبے مزید بلند کر دیا ہے۔

ظفر اقبال نے اپنے کالم ’’دال دلیا‘‘ میں اشرف نقوی کی شاعری کو سراہا ہے اور اُنھوں نے لکھا کہ:

''مجھے ''بیاض'' کے شمارے میں آخری صفحے پر چھپنے والی غزل کے اشعار نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ اشرف نقوی کا نام پہلی بار میرے نوٹس میں آیا ہے اور اس کا پوٹینشل دیکھ کر مجھے بے حد اطمینان ہوا ہے کہ اسے ابھی بہت سا کامیاب سفر کرنا ہے، اگر اس کی جستجو کا یہی عالم رہا۔ الفاظ پر اس کی قدرت اور انھیں برتنے کا سلیقہ ہے جس نے اس کے سفر میں یہ پختگی اور تاثیر پیدا کی ہے۔ میری دُعائیں اس کے ساتھ ہیں۔

ہم خواب کے مجرم ، کبھی تعبیر کے مجرم
تجویز کرے نیند ہی تعزیر ہماری
ہر ایک زمانے میں چلے جاتے تھے بے خوف
یہ وقت ہوا کرتا تھا جاگیر ہماری
وہ لَوح بھی لگتا ہے کہ پانی پہ بنی تھی
جس لَوح پہ لکھی گئی تقدیر ہماری
دیکھا کیے ہم ای طرف ہو کے تماشا
عُجلت سے اُلجھتی رہی تاخیر ہماری
ہم مثلِ زمیں اور ہے وہ چاند ہمارا
رکھے گی اُسے کھینچ کے تاثیر ہماری

محمود اختر خان اشرف نقوی کے مجموعے کے حوالے سے ایک مضمون ''میر کی شعری روایت کا امین، ''زادِحرف'' کا اشرف نقوی'' میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آگے زبانِ یار کے خط کھینچا سب نے میرؔ
پہلی جو بات اُس کی کہیں تو کتاب ہو

''اُردو شاعری بالخصوص غزل میں کوئی بھی شاعر میر تقی میرؔ کے سحر سے ہر عہد میں نہیں بچ سکا۔ بلکہ خدائے سخن کا سحر ابد تک جاری و ساری رہے گا۔ آپ کا اصل نام میر محمد تقی اور تخلص میرؔ تھا۔ ۱۷۲۳ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام محمد علی تھا لیکن علی متقی کے نام سے مشہور تھے اور درویشِ گوشہ نشین تھے۔ میرؔ نے ابتدائی تعلیم اپنے

والد کے دوست سید امان اللہ سے حاصل کی میرؔ ابھی نو برس کے تھے کہ وہ چل بسے۔ ان کے بعد ان کے والد نے تعلیم و تربیت شروع کی مگر چند ہی ماہ بعد اُن کا بھی انتقال ہو گیا۔ یہاں سے میرؔ کی زندگی میں رنج والم کے طویل باب کی ابتداء ہوئی۔ اُن کے سوتیلے بھائی محمد حسن نے اچھا سلوک نہ کیا۔ تلاشِ معاش کی فکر میں دہلی پہنچے اور ایک نواب کے ہاں ملازم ہو گئے مگر جب نواب موصوف ایک جنگ میں مارے گئے تو میر تقی میرؔ آگرہ لوٹ آئے، لیکن گزراوقات کی کوئی صورت نہ بن سکی۔ چنانچہ وہ دوبارہ دہلی روانہ ہوئے اور اپنے خالو سراج الدین آرزو کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ سوتیلے بھائی کے اُکسانے پر خان آرزوؔ نے بھی پریشان کرنا شروع کر دیا۔ کچھ غمِ دوراں، کچھ غمِ جاناں سے جنوں کی کیفیت پیدا ہو گئی۔

میرؔ کا زمانہ شورشوں اور فتنہ وفساد کا زمانہ تھا۔ ہر طرح کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے بعد بالآخر میرؔ گوشۂ عافیت کی تلاش میں لکھنؤ روانہ ہو گئے اور سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے بعد لکھنؤ پہنچے۔ وہاں اُن کی شاعری کی دُھوم مچ گئی۔ نواب آصف الدّولہ نے تین سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا اور میرؔ آرام سے زندگی بسر کرنے لگے لیکن تُند مزاجی کی وجہ سے کسی بات پر ناراض ہو کر دربار سے الگ ہو گئے۔ آخری تین سالوں میں جوان بیٹی اور بیوی کے انتقال نے صدمات میں اور اضافہ کر دیا۔ آخر اقلیمِ سخن کا یہ حرماں نصیب شہنشاہ ۱۸۱۰ء میں لکھنؤ کی آغوش میں ہمیشہ کے لیے سو گیا۔

میرؔ کی زندگی کے بارے میں معلومات کا اہم ذریعہ اُن کی سوانح عمری ''ذِکرِ میرؔ'' جو اُن کے بچپن سے لکھنؤ میں اُن کے قیام کے آغاز کی مدت پر محیط ہے۔ میر تقی میرؔ نے اپنی زندگی کے چند ایام مغلیہ دہلی میں صرف کیے۔ اُس وقت وہ پرانی دہلی میں جس جگہ رہتے تھے اُسے 'کوچۂ چلم' کہا جاتا تھا۔ ویسے تو میرؔ صاحب کی شعری ثنا خوانی میں شعراء کے دفتر کے دفتر موجود ہیں لیکن یہاں تنگیٔ قرطاس کے سبب چند شعراء کے اشعار درج کیے جاتے ہیں:

ریختہ کے تمھی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

نہ ہُوا پر نہ ہُوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقِ یاراں نے بہت زور غزل میں مارا

شعر تو میرے بھی پُر درد ہیں لیکن حسرتؔ
میرؔ کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

سوزِ دل گر چاہیے اشعار میں
پڑھتے رہو ، مِلتے رہو تم میرؔ سے

میں اشرف نقوی کو میرؔ کی شعری روایت کا امین قرار دیتا ہوں۔ اِس تناظر میں اشرف نقوی لکھتے ہیں:

لفظ تاثیر سے الگ رکھا
شعر جو میرؔ سے الگ رکھا
رنج شعروں میں ڈھالنا اشرفؔ
میرؔ صاحب سے استفادہ ہے

نہ اب ہے مِیرؔ سا رنگِ سخن ، نہ غالب سا
کہ جب سے رُوٹھ کے اہلِ زباں چلے گئے ہیں

اشرف نقوی نے میرؔ صاحب کے کہے کو اپنے عمل سے کتاب کی صورت ''زادِ حرف'' میں سچ کر دکھایا۔

میں کتابِ زیست کا عنوان ہوں
کیوں نہ ہوں میرے معانی مختلف

''زادِ حرف'' کے حصول میں معانی کا مختلف ہونا اِتنا سہل نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ لہو تھوکنے کے لیے خود کو وقف کرنا پڑتا ہے، اس کے لیے ایک طویل وقت درکار ہوتا ہے۔ اشرف

نقوی کے سفر کا پہلا پڑاؤ ''آخرش'' جو دو دَہائیوں پر محیط ہے۔ دوسرا پڑاؤ ''زادِحرف'' کا دورانیہ ایک دَہائی یعنی تین دَہائیوں کی مسافت میں خود کو تلاش کرنے کا عمل ہے۔ اِس دریافت کے عمل میں شب بے داریاں، حرف کی حُرمت کی پاس داریاں۔۔۔۔ یہ کرم خاص سچی لگن سے مشروط ہے۔

عجز کی انتہا یہ کہ خود کو تہی داماں کہنا، باوصف ہونے کے باوجود خود کو بے ہُنر کہنا ہی درحقیقت ہُنر کا کمال ہے۔ اِس تناظر میں اشرف نقوی کے کچھ اشعار دیکھیے:

خود کو تو اب تلک بھی میسّر نہیں ہوئے
تجھ کو زمانے ہوں گے کہا دست یاب ہم

مگن ہوں گرچہ خود کو جاننے میں
نہیں مجھ پر کُھلے اسرار میرے

۔۔۔۔۔۔۔

ہم یوں ہی رات کو تو نہیں جاگتے میاں!
ہم اہلِ حرف کی یہ کمائی کا وقت ہے

۔۔۔۔۔۔۔

مجھ پر کرم ہے خاص ، خدائے سخن ترا
مَیں معتبر ہوں آج ہُنر کے بغیر بھی

اِس سلسلے میں اشرف نقوی کے کچھ اشعار دیکھیے:

رَہِ سُخن میں نئی منزلیں دکھانے کو
یہ میرا دل ، یہ مِرا رہنما سلامت ہے

۔۔۔۔۔۔۔

وہ ستارہ بھٹک نہیں سکتا
جس ستارے کے رہنما ہیں ہم

۔۔۔۔۔۔۔

سفر ازل سے ہے سیّارگاں کے ساتھ مِرا
سو کیسے چھوڑے گا اشرف مِرا مدار مجھے

اِس مختصر نشست میں آپ اشرف نقوی کی شعری فضا سے یقیناً کچھ نہ کچھ ضرور مانوس ہوئے ہوں گے۔آپ کی یہی مانوسیت اشرف نقوی کی داد ٹھہرتی ہے۔داد کو متحرک رکھیے۔نعیم گیلانی نے بھی اشرف نقوی کے مجموعوں اور شاعری پر بے حد کھلے دل سے تبصرہ کیا ہےاور ہر پہلو پر سیرِ حاصل بحث کی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ:

''ان دنوں ادبی حلقوں میں اشرف نقوی کی شاعری کے کمال بلکہ کمالات کا تذکرہ و توصیف ہر خاص و عام کی زبان پر موجود ہے۔اشرف نقوی کا پہلا شعری مجموعہ ''آخرش'' مطبوعہ ۲۰۰۶ء قارئینِ ادب سے داد وصول کر چکا ہے۔

''آخرش'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اشرف نقوی کی شاعری ایک جدید طرزِ احساس اور فہم و ادراک کی شاعری ہے۔اشرف نقوی نے تخلیق کاری کے فن اور حرف وصوت کے اعجاز سے مضمون آفرینی کے نہایت بلیغ ،نہایت خوب صورت اور نہایت لطیف پیکر تراشے ہیں۔

بقول ڈاکٹر خواجہ زکریا:

''شاعری میں اپنی شناخت بنانے کے لیے بہت عرصہ درکار ہوتا ہے۔ یہ دس پندرہ سال نہیں بلکہ تیس چالیس سال کی بات ہوتی ہے۔تیس چالیس سال مسلسل لکھنا اور اچھا لکھنا پھر کہیں جا کر آپ کی شناخت بنتی ہے۔''

اشرف نقوی اِس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ وہ ان راستوں پر گامزن ہو چکے ہیں جن پر چل کر وہ اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہونے والے ہیں۔وہ نفی اور اثبات کے فرسودہ اصولوں سے گریز کرتے ہوئے زندگی کے متحرک اور جاوداں منظر نامے کو اپنے مشاہدے اور تجربے کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔

صاحبو! سوائے کتاب کے نام پر اعتراض کے، میں اشرف نقوی کا بطور شاعر کھلے دل سے استقبال کرتا ہوں۔میں اشرف نقوی صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ

پہلی کتاب کا نام ''آخرش'' کیوں؟ ۔۔۔۔بھئی! یہ تو آپ کی شروعات ہے ابھی تو تمھیں اپنے قارئین اور مداحین کے لیے اَن دیکھے جہانوں کی خوش خبریاں لانی ہیں، ابھی تو انجانے موسموں کی نوید سنانی ہے۔ ابھی تم نے اُن گم گشتہ جزیروں کی داستانیں بیان کرنی ہیں جن کو ابھی تک کسی نے دریافت نہیں کیا کہ ابھی تو تم نے منظر سے پس منظر کی مسافتوں کا احوال کہنا ہے۔ میں دل و جان سے دعا گو ہوں کہ خالقِ لوح وقلم تمھاری توفیقات میں اضافہ فرمائے اور نقشِ ثانی، نقشِ اوّل سے کہیں زیادہ فروزاں وتابدار ہو۔''

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک اشرف نقوی کے دونوں شعری مجموعوں کے بارے میں ناقدانہ رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''نہ جانے کیوں میں اشرف نقوی کو دیکھتا ہوں تو مجھے امام بخش ناسخ یاد آجاتے ہیں۔ اُسی طرح دیکھنے میں پہلوان، پرکھنے میں سوجھوان ہیں۔ ان کے کلام پر نظر کریں تو معیار قاری کی بلائیں لینے لگتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ اشرف نقوی نے بیس بائیس سال کی ریاضت کے بعد قارئینِ اُردو ادب کو 2006ء میں ''آخرش'' کا تحفہ دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ''سبحان اللہ، شاباش اور واہ واہ'' کی صدائیں لگاتار ان کے مشامِ جاں کو معطّر کرتی رہیں۔ میرے ایک بے تکلّف دوست ایک دن ان کی ظاہری جوانی کو دیکھ کر فرمانے لگے: ''تمھارے اِس دوست نے غلط شعبے کا انتخاب کیا ہے۔ اگر یہ آنکھیں بند کر کے بھی دادا گیری کی طرف آجاتا تو پورے علاقے کے ''کن ٹٹے'' اِس کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے۔'' میں نے عرض کیا کہ ''دھیرج رکھو میرے دوست! یہ اگر اس میدان میں بھی اسی استقامت سے ڈٹا رہا تو بہت جلد اس کی اپنی نسل کے بے شمار شاعر، ادیب اس کے سامنے پانی بھرتے نظر آئیں گے۔''

''آخرش'' کے دیباچہ میں شاہین عباس نے ''اے مخاطب'' کے عنوان سے اشرف نقوی کے شعری اسلوب اور شاعری پر گفتگو کی ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''نوجوان شاعر اشرف نقوی کا زیرِ نظر مجموعۂ کلام حُرمتِ حرف کی پاسداری کا ایک ایسا مکالمہ ہے جس کے حضور وغیاب قابلِ دید بھی ہیں اور قابلِ داد بھی۔ ہر عہد کی طرح موجودہ

دور میں بھی شاعر کو کچھ سوالات کا سامنا ہے۔یعنی کہ ادب کا زندگی کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ عصری شعور کیا چیز ہے اور شعر کے لیے کتنا ناگزیر ہے؟ کیا کرافٹ مین شپ ایک غیر تخلیقی جوہر ہے؟ اُردو ادب کس تیزی کے ساتھ کلیشے میں تبدیل ہو رہا ہے اور ایسے میں ادیب پہ کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ وغیرہ۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ادب اور زندگی میں کوئی ایسا تعلق نہیں جسے راست یا معکوس کی نسبتوں سے جانچا جا سکے۔ اس تعلق کی نسبت تو لامتناہی ہے اور جمالیات ہی اس مذکورہ نسب کی بنیاد گزار ہے۔یعنی سیاسی، سماجی یا عصری رُجحانات جمالیات کی چھلنی میں چھن کر ہی مقامِ سفر کو پہنچ سکتی ہے۔بصورتِ دیگر یا شعر کا یہ غوغا شورو شر میں اضافے کا باعث ہو تو ہو، تاریخ کی روک ٹوک کے سامنے ٹھہرنے سے قاصر ہے۔

اشرف نقوی نے اپنی محبوب علامتوں کی زبان میں اپنے تجربے کے تحفظ کا سامان کیا ہے۔اس کے تمثال وخیال میں تکرار کی مدبرانہ خُو کچھ اور نہیں، ایک منضبط شعری فضا کے معمار ہی کا متبادل ہے۔ محض ڈکشن کی ڈھال اندرون و بیرون کے خالی پن کی محافظ نہیں ہوسکتی۔شعریات کے کل کرافٹ سے مملو معانی، ایسی نگہِ نگہدار کا حلیف ہوتا ہے جس سے دل و دماغ اکائی کی صورت میں کارگر، علیحدگی کی رُسوائی سے بچ جاتے ہیں مگر طویل ریاضت کا یہ ثمر ہر کس و ناکس کے حصہ میں نہیں آتا۔اشرف نقوی کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ شاعر نے کس کس معانی میں معلوم و نامعلوم کی ترویج وتجدید میں حصہ لیا ہے:

سنا رہا ہے کہانی یہی غبار مِرا
ملا ہوا ہے کسی دشت سے دیار مِرا

کیا خبر تجھ کو جانتا ہی نہ ہو
جو ستارہ ترے خلاف ہوا
آئینہ بدگمان تھا مجھ سے
گِر کے ٹوٹا تو انکشاف ہوا

تمام دشت و دمن میرے آگے آگے چلے
اور ان کے پیچھے مِرا قافلہ روانہ ہوا

خاک ہوں اشرف اور اُڑ کر
اپنے سر تک پہنچا ہوں
ہُوں ادُھورا ، مجھے مکمل کر
مجھ کو مالک! گزار مٹی سے

زیرِنظر کتاب میں اشرف نقوی نے بھی اپنے باطن کے آدمی کو ظاہری چکا چوند کی بھینٹ نہیں چڑھایا۔عصری موشگافیوں کے ردّوقبول کا معاملہ اسی شخص پر چھوڑ دیا ہے کیوں کہ یہ شخص خدا کا زیادہ مقرب بندہ واقع ہوا ہے۔سخن آباد کے قدیم وجدید آثار بتاتے ہیں کہ توفیق وعطا کی منزل پر باطن کے اس آدمی کا وظیفہ زیادہ مؤثر اور دستِ دُعا زیادہ لائقِ لحاظ مانا گیا ہے۔‘‘

(5جنوری،2005ء،صفحہ14)

ادبی رسالہ ’’عقیدت‘‘ سرگودھا میں اشرف نقوی کی کتاب ’’آخرش‘‘ کے بارے میں تبصرہ ہوا جس میں اُن کے اِن اشعار کو بطور حوالہ درج کیا گیا:

تمھارے لمس سے محظوظ کس طرح ہوتے
کہ ہم کو خواب سے باہر بلا لیا گیا تھا
اِسی لیے تو ابھی تک میں نامکمل ہوں
ادُھورا چاک سے مجھ کو اُٹھا لیا گیا تھا
تھے صرف ہم ہی جو رکھتے تھے دل بھی دُنیا بھی
یوں آگ پانی کو باہم ملا لیا گیا تھا

’’آخرش‘‘ اشرف نقوی کی کوئی آخری کتاب نہیں بلکہ پہلا شعری مجموعہ ہے اور یہ پہلا

شعری مجموعہ شاید اِتنا مضبوط ہے کہ شاعر نے اسے ''آخرش'' کا نام دے دیا۔ بہرحال اشرف نقوی کی غزلوں کے بین السّطور جو ایک عکس سا اُبھرتا ہے جس کے ہاتھ میں قلم اور دانتوں کے نیچے اُنگلی ہے۔ وہ عکس مجسم ہو کر اشرف نقوی کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ میرا قیافہ ہو لیکن یہ قیافہ نہیں ہو سکتا کیوں کہ تخلیق اپنے خالق کا عکس ہی ہوتی ہے۔'' (رسالہ ''عقیدت'' سرگودھا، صفحہ 207)

گلزار بخاری سیّد اشرف نقوی کی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں:

''جب ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے نئی شاعری شائع کرنے کا اِرادہ کیا اور مختلف شعراء کی ایسی تخلیقات کو سامنے رکھتے ہوئے جو ستر کی دہائی کے بعد سامنے آئے، متعدد شعراء کے نام مختلف احباب کو بھجوائے جس کی بنیاد پر شعراء کا انتخاب کیا۔ نئی تخلیقات کے شعراء کو منتخب کرنے والے مرتبین میں ظفر اقبال جیسے سینئر شاعر بھی شامل تھے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مجموعی طور پر جن لوگوں کو زیادہ آراء کا مستحق گردانا گیا اس فہرست میں شیخوپورہ کے صرف دو شعراء کو جگہ ملی۔ ان میں سرِ فہرست شاہین عباس اور آگے کہیں جا کر نوید رضا بھی تھے۔ اِس کے ساتھ ہی منظر نامے پر جو شعراء شیخوپورہ کے افق پر نمودار ہوئے اور اپنے کام کے ذریعے نام بنایا اُن میں ارشد نعیم سے لے کر نعیم گیلانی، اظہر عباس اور اشرف نقوی جیسے شاعر شامل ہیں۔''

اشرف کے شعر پڑھ کر احمد مشتاق یاد آتے ہیں لیکن اشرف نقوی کو ڈاکٹر ضیاء الحسن نے بھی دادو تحسین کا مستحق گردانا:

مجھے خبر ہے کہ ہوتا ہے کیا فراق کا دُکھ
میں وہ ستارہ ہوں جو کہکشاں سے باہر ہے
ہجر معراج ہے محبت کی
اور محبت وصال میں خوش ہے

ڈاکٹر ضیاء الحسن نے اشرف نقوی کی شاعری پر تفصیلاً گفتگو کی ہے اور ان کے فنی محاسن

کے ہر پہلو کو روزِ روشن کی طرح عیاں کیا ہے۔''زادِ حرف'' کے شروع میں اُنھوں نے ایک سیر حاصل گفتگو کی ہے جو کہ مضمون کی صورت میں کتاب کے آغاز میں موجود ہے۔

''اشرف نقوی کا شمار اکیسویں صدی میں نمایاں ہونے والے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق شیخوپورہ سے ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مضافات کے شعراء دبے رہتے تھے اور ادبی منظرنامے پر لاہور اور کراچی کی حکمرانی تھی۔گلوبلائزیشن نے مجموعی طور پر انسانی شعور میں جو اضافہ کیا ہے، بڑے شہروں اور مضافات کی تفریق کا خاتمہ بھی اس میں شامل ہے۔اب اہلِ ہُنر کہیں بھی بیٹھ کر اپنے جوہر کے اظہار میں تمام دُنیا کو شریک کر سکتے ہیں۔میں اشرف نقوی سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں لیکن ان کی شاعری سے پتہ چلتا ہے کہ مذہبی ذہن رکھنے والے انسان ہیں۔اُن کے کچھ اشعار جو اُن کے مذہبی رُجحان کی نشان دہی کرتے ہیں:

تُو ہی فخر و غرور ہے میرا
میرا سارا وقار تجھ سے ہے
میری خوشیوں میں رونقیں تجھ سے
میرا غم پُر بہار تجھ سے ہے
میری دُنیا اور آخرت میری
میرے پروردگار تجھ سے ہے
ذکر تیرا ہی باعثِ تسکین
وحشتوں میں قرار تجھ سے ہے
تُو نہ چاہے تو کچھ نہیں اشرفؔ
یہ تو بس ذی وقار تجھ سے ہے

اشرف نقوی کی شاعری میں مذہبی شعور کا اظہار صرف ان اشعار میں ہی نہیں ہوا جن میں مذہب کی پیدا کردہ تہذیب سے تلمیحاتی استعارات وضع کیے گئے ہیں بلکہ ان کی شاعری شعری منطق اور تخلیقی تجربہ اسی مخصوص شعور کے زیرِ اثر کارفرما ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اِس کے علاوہ واقعۂ کربلا سے منسلک استعارے فراوانی سے استعمال ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ امام حسینؑ اور شہدائے کربلا کی جرأت اور اُن پر گزرنے والے مصائب ان کے اشعار میں نظر آتے ہیں۔

دیوار روشنی کی ہے در روشنی کا ہے
کربل میں خیمہ زن ہے جو گھر روشنی کا ہے
حُر کا جبیں جھکانا درِ اہلِ بیت پر
اِک روشنی کے نام سفر روشنی کا ہے
اشکِ غمِ حسینؑ کی تاثیر دیکھیے
ہاتھوں میں میرے آج ہُنر روشنی کا ہے

میں ہوں بیمار ، پڑھ کے نادِ علیؑ
مجھ پہ اِک بار دم کیا جائے

اسلام کا چراغ بجھے گا نہ تاابد
خون اِس دے گئے ہیں شہیدانِ کربلا
ہائے وہ جلتے خیمے ، وہ بچے ، وہ بیبیاں!
ہائے وہ وقتِ شامِ غریبانِ کربلا
یہ بھی مِرے حسینؑ کا فیضان ہی تو ہے
رشکِ فلک بنا ہے بیابانِ کربلا

ڈاکٹر ضیاء الحسن کہتے ہیں:

''اشرف نقوی کا یہ مجموعہ ان کے مجموعی تخلیقی مزاج کا آئینہ دار ہے۔جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ میں ان سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں۔میرا سارا تعلق ان کی شاعری کے حوالے سے ہے اور میں ان کی ذات، شخصیت اور تخلیقی تجربے سے اس آئینے کے ذریعے واقف ہوا ہوں۔ان کی شاعری منفی صورتِ حال میں اثبات کی آرزو کی آئینہ دار ہے۔''
(۱۱ستمبر ۲۰۱۴ء)

ان کے اشعار درج ذیل ہیں:

کبھی بکھر نہیں سکتا میں یاس کے ہاتھوں
مِرے لبوں پہ ابھی تک دُعا سلامت ہے
شبیہِ وقت بنانے کو پکے رنگوں سے
مِرا ہُنر ، مِری فکرِ رسا سلامت ہے
رَہِ سُخن میں نئی منزلیں دکھانے کو
یہ میرا دل ، یہ مِرا رہنما سلامت ہے

اشرف نقوی سے ملاقات میں اُن کو لکھے جانے والے خط پر میری نظر پڑی جو کہ ملک کے معروف شاعر لیاقت علی عاصم کی طرف سے تھا، اس میں لکھے جانے والے الفاظ کچھ یوں تھے:

''بھائی اشرف نقوی!

آداب!

پہلے تو آپ کو آپ کے پہلے مجموعے کی اشاعت کی خوشی کی مبارک باد ہو۔
دوسری بات یہ ہے کہ میں ادب میں ایک اچھے شاعر سے متعارف ہونے کی مسرّت سے ہمکنار رہوا۔ممنون ہوں آپ کا کہ آپ نے ''آخرش'' بھجوا کر مجھے خودساختہ گمنامی کے الزام سے بری کروایا۔

لیاقت علی عاصمؔ

یکم نومبر ۲۰۰۶ء''

ماہنامہ ''ادب دوست'' لاہور کے فروری 2017ء کے شمارے میں اشرف نقوی کی شاعری اور ان کے ادبی کام پر تجزیاتی مضمون شائع ہوا۔ ادبی حلقوں سے تعلق رکھنے والوں نے ان کے کام اور فن کی داد دی ہے اور ان کی شاعری کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ ارشد نعیم کا کہنا ہے کہ صنفِ غزل پر مشتمل یہ مجموعہ معاصر غزل کے جملہ رجحانات اور اسالیب کے تناظر میں ایک اہم اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

''آخرش'' کی اشاعت کے بعد ان کے فن پر داد دینے والوں میں امجد اسلام امجدؔ، عطاء الحق قاسمی اور شاہین عباس جیسے اہلِ قلم شامل تھے۔ جن دِنوں ''آخرش'' طباعت کے مراحل میں تھی اور اس کا مسودہ عطاءالحق قاسمی کے ہاں فلیپ کے لیے پڑا تھا تو احمد فراز (مرحوم) عطاءالحق قاسمی سے ملنے لاہور آئے۔ اس قیام کے دوران باتوں باتوں میں احمد فرازؔ نے نئی غزل کے انحطاط کی بات کی تو عطاءالحق قاسمی نے ''آخرش'' کا مسودہ اُٹھا کر اس میں سے چند اشعار احمد فراز کو سنائے تو احمد فراز کو کہنا پڑا کہ اس انحطاط کی فضا میں بھی اچھا کام بہرحال ہو رہا ہے۔

''آخرش'' میں موجود شعری سلیقہ اور فنی حُسن نو برس کی طویل مسافت کے بعد ''زادِ حرف'' میں کچھ اور نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔ آخر میں یہی کہنا چاہوں گی کہ اشرف نقوی کی ادبی حیثیت کو ان کے مجموعوں ''آخرش'' اور ''زادِ حرف'' نے نمایاں کیا ہے۔ اس کے بنے بنائے مقام کو کئی زینے بلند کر دیا ہے۔ اشرف نقوی کی شاعری کا اوّلین مجموعہ ان خوبیوں سے متّصف ہے جو اکثر و بیشتر شعراء کے مجموعوں میں موجود نہیں ہوا کرتیں۔ اشرف نقوی نے غزل کے فن کی بنیادوں کو پوری طرح سمجھتے ہوئے نئی غزل کے ساتھ اپنا

رشتہ جوڑنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

ڈاکٹر محمد اکرم سرا نے ماہنامہ ''ادب دوست'' جنوری 2018ء کے شمارے میں اشرف نقوی کے حوالے سے طنز و مزاح پر مبنی ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''اور جانا گھر میں اشرف نقوی کے''اِس کا آغاز اِس طرح ہوتا ہے:

''حضراتِ گرامی! ہر گھر کو ایک گلی جاتی ہے یا پھر ایک گلی کئی گھروں کو محیط ہوتی ہے۔ تاہم کچھ ایسے گھر بھی دیکھے جو صرف گلی ہوتے ہیں۔ ان میں ایک طرف سے داخل ہوئیے تو دوسری سمت سے نکل جائیے جیسا کہ میر تقی میرؔ کا گھر۔ حضرت میرؔ نے دستِ اندوہ کے ہاتھوں ستم اُٹھا کر ایسا گریہ اُٹھایا کہ گھر کی سب دیواریں مسمار ہوئیں۔ تب گھر کی یہ حالت ہوئی کہ کتے اور بلیاں ایک طرف سے آتے اور بلا روک ٹوک دوسری طرف کو نکل جاتے۔ جبکہ اُس عہد کے فرمانروا رعایا کے مسائل سے بے خبر ایک دوسرے کی آنکھیں نکالنے کے فن میں طاق ہوتے رہے جیسے وہ فرمانروا نہ ہوئے ، آئی سپیشلسٹ (Eye Specialist) ہو گئے۔

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
اُنھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

اکرم سرا، اشرف نقوی کے گھر کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں کہ ان کے فن کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

''عزیزی اشرف نقوی کے گھر کو کئی ایک گلیاں جاتی ہیں اور اس اختصاص کے ساتھ کہ ہر گلی پہلی سے بڑھ کر خراب ہے۔ گویا گھر نہ ہوا گھنٹہ گھر ہو گیا۔ گھنٹا گھر آسان ہے کہ تلاش کرنے پر مل جاتا ہے جب کہ ان کے گھر کا بھید گلیاں گلیاں تلاشنے کے بعد بھی نہیں کھلتا اور آخر یہ انسان طلسمی داستان کے ہیرو کی طرح خود کو کسی نئی گلی کے روبرو پاتا ہے۔''

وہ اشرف نقوی کے گھر کا نقشہ اور گلیوں کی داستان کچھ اِس طرح بیان کرتے ہیں کہ

پڑھنے والا اپنی ہنسی ضبط نہیں کر پاتا۔

''آپ کے گھر کو جتنی گلیاں جاتی ہیں سب میں سکتہ پڑتا ہے۔ایک گلی میں داخل ہوں تو وہ افتاں وخیزاں لیے آپ کو اُن کے گھر کے قریب سے گزار کر اپنی ہی کسی ماں بہن کے سپرد کر کے منظر سے اِس طرح غائب ہو جائے گی جیسے کبھی تھی ہی نہیں اور آپ اس نئی پیش پا اُفتادہ گلی میں کھڑے کھڑے شاعر ہو جائیں گے۔ایک روز ان گلیوں کی سیاحت میں ہمیں ایک خانماں خراب مل گئے۔اُن سے پوچھا حضرت یہاں کہیں اشرف نقوی رہتے ہیں۔ ہمیں ان کے دولت کدہ پر جانا ہے۔بولے،شوق سے جائیں کب منع کیا ہے۔پر اِتنا تو بتا یئے کہ یہ اشرف نقوی کون ہیں اور کام کیا کرتے ہیں۔
عرض کیا،شاعر ہیں۔''

اُنھوں (ڈاکٹر اکرم سرا) نے اپنے اِس مزاح سے اشرف نقوی کی سادہ طبیعت کا بتایا ہے۔انھیں مشہور ہونے سے کوئی غرض نہیں۔وہ تو بس چپ کر کے اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔اشرف نقوی کی شاعری ان کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اشرف نقوی کے بارے میں یہ مضمون ان کی زندگی اور حالات کی منظر کشی کرتا ہے۔اسی طرح مضمون کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:

''وہ حضرات جو اشرف نقوی کو جانتے ہیں لیکن ان کا گھر نہیں جانتے،ان کے لیے گزارش ہے کہ وہ اپنے طور پر ان کے ہاں جانے کا انتظام کر لیں کہ جہاں ارشد نعیم ان کے گھر کا پتہ بھول چکے ہیں وہاں ہم کس کھیت کی مولی ہیں،لہٰذا ہم دوستوں کو نہایت افسوس کے ساتھ یہ اطلاع دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اشرف نقوی کے گھر کی بابت آئندہ ہم سے رابطہ نہ کیا جائے کیوں کہ تا دمِ حیات ہم اُن کے گھر کا پتہ بھول چکے ہیں۔'' (صفحہ،۵۰)

شعبہ انگریزی کے اُستاد پروفیسر علی آصف نے ''نسلِ گم شدہ اور ''زادِ حرف'' کے نام سے اشرف نقوی کے شعری مجموعے ''زادِ حرف پر ایک مضمون لکھا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ''زادِ حرف'' سیّد محمد اشرف کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ''آخرش'' تھا جو 2006ء میں شائع ہو کر

قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔اشرف نقوی درس و تدریس سے وابستہ اُستاد شاعر ہیں۔ زبان و بیان وعروض پر کامل گرفت رکھتے ہیں۔شیخوپورہ کی ادبی تنظیم ''دریچہ'' کے قدیمی رُکن ہیں۔ شعر خود ہی شاعر کو رُکنے اور ٹکنے نہیں دیتا۔لہٰذا 2015ء میں ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''زادِحرف''منظرِ عام پر آیا جس کی تقریبِ پذیرائی شیخوپورہ پریس کلب میں ہوئی۔ڈاکٹر ضیاء الحسن ،ڈاکٹر اشفاق احمد ورک،شاہین عباس،ڈاکٹر خالد ندیم،ارشد نعیم،نعیم گیلانی اور علی آصف جیسے معروف ادباء اور شعرائے کرام نقوی صاحب کے مدح خوانوں میں ہیں۔''زادِحرف'' میں حمد،نعت اور سلام کے علاوہ نقوی صاحب نے قریباً 69 غزلیں ہدیۂ قارئین کی ہیں۔زیرِ نظر مضمون نقوی صاحب کی کتاب ''زادِحرف'' کے ایک پہلو پر رقم ہوا ہے۔اس کا عنوان ''نسلِ گم شدہ اور زادِحرف'' ہے جو انگریزی زبان وادبیات کے اُستاد علی آصف کی دیدہ ریزی اور جگر کاوی کا حاصل ہے۔

''جنگِ عظیم کے دوران اور اس سے بچ جانے والی نسل کو "The Lost Generation" کہا جاتا ہے۔اس اصطلاح کو امریکی ناول نگار ہیمنگ وے نے اپنے ناول "The Sun also Rise" میں 'Epigraph' اقوالِ زریں کے طور پر استعمال کیا ہے۔ درحقیقت یہ اصطلاح اُنھوں نے 'Gertrude Skin' سے مستعار لی جس نے اپنی گاڑی کی سروس کے دوران Gerage کے مالک کے منہ سے اس اصطلاح کو اُس وقت سُنا جب وہ ایک ایسے شاگرد کو ڈانٹ رہا تھا کہ آپ سب 'Lost Generation' ہیں جن کی مسافت بے سمت اور زندگی مقصد سے عاری ہے۔ برطانیہ میں اس اصطلاح ک اطلاق اُن مرنے والوں پر ہوا جو طبقۂ اشرافیہ اور شعر وادب سے تعلق رکھتے تھے۔ جو شعراء اِس جنگ میں کام آئے اُن میں ایڈورڈ ٹامس،ونصر اذاؤں اور بٹر ورتو نمایاں ہیں۔فرانس میں یہ اصطلاح مہاجرین آباد کاروں کے لیے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ 'Generation in Flame' کے نام سے مقبول ہوئی۔اگر ہم اِس اصطلاح کو آفاقی کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا کیونکہ کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس نے اس روحانی کرب کا ذائقہ نہ چکھا ہو۔''

پاکستان کے حوالے سے دیکھا جائے تو قائدِ اعظم کی وفات کے بعد ملک ان چند لوگوں کے ہاتھوں میں آ گیا جن کا مقصد 'Islamic Lab' کا قیام نہیں تھا بلکہ اُنھوں نے اِس نعرے سے نچلے طبقے کے لوگوں میں مذہبی ولولہ اجاگر کر کے ایک ایسا خطہ حاصل کیا جہاں اُن کی نسلیں حکمران بن کر دادِ عیش دیتی رہیں۔

یہ لڑائی ایک قوم کی دوسری قوم سے نہیں بلکہ ایک اشرافیہ کی دوسری اشرافیہ سے تھی جو پاور شیئرنگ (Power Sharing) میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ ان محدود لوگوں کے علاوہ پوری قوم ناآسودگی کے کرب سے دوچار ہونے لگی کہ یہ تو اُن کے خواب کی تعبیر نہیں جس کو اُنھوں نے جاگتی آنکھوں میں لمحہ لمحہ سنوارا تھا۔ ایک نسل کے بالوں میں چاندی اُترنے لگی اور دوسری نسل جس نے گہوارے کے عہد سے لڑکپن میں پاؤں رکھا ہی تھا کہ اُسے سقوطِ ڈھاکہ جیسے ناقابلِ یقین واقعے کا سامنا کرنا پڑا۔ خواب کی تتلی ایک پر سے محروم ہو چکی تھی۔ یہ نسل اُس یتیم کی طرح تھی جس کے باپ کے مرنے کے بعد اُس کے مکان پر قبضہ ہو چکا ہو۔ اس نسل کو پاکستان کے تناظر میں 'Lost Orphan Generation' کہہ سکتے ہیں۔

''زادِ حرف'' میں ان دونوں نسلوں کا عکس اشرف نقوی کے فن کے کینوس پر جگہ جگہ مگر مدھم رنگوں میں اُبھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اب تک پاکستان کی ہر نسل کو 'Lost Orphan Generation' کی چھتری تلے رکھا جا سکتا ہے۔

چلتا ہوں روز و شب میں ڈگر کے بغیر بھی
منزل کی ہے تلاش سفر کے بغیر بھی

یہ بات مگر حیران کُن ہے کہ اِس منظر نامے میں جہاں ہر طرف بربریت اور دُھول ہی دُھول نظر آتی ہے، اشرف نقوی شعلہ بیانی کی بجائے بارانی لہجہ میں بات کرتے ہیں جو اُن کے اعتماد اور رجائیت کی عکاسی کرتا ہے۔ جمشید چشتی کا یہ شعر اشرف نقوی پر خوب صادق آتا ہے:

میرا لہجہ تو ہے بارش جیسا
میں کہاں شعلہ بیانی کے لیے

خود اشرف نقوی صاحب اپنے اِس وصف کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ:

پھولوں کی طرح رکھتے ہیں گفتار کا لہجہ
ہم جنگ میں بھی شعلہ بیانی نہیں کرتے

اشرف نقوی کی شاعری کی جہاں بہت ساری جہتیں ہیں وہیں ایک جہت اس حدِ رائیگانی سے عبارت ہے جو اِس ملک کے رہنے والے ہر شہری کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ اب اِس بات سے آگے نکلنا ہوگا کہ ساٹھ سال قوم کی زندگی میں ایک دن کی طوالت کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ بات قوم پر صادق آتی ہے، ہجوم پر نہیں۔ اِسی لیے اشرف نقوی کے ہاں وقت کی تیز رفتاری اور اپنی آبلہ پائی کا تقاضا جگہ جگہ نظر آتا ہے۔''

وقت آگے نکل گیا اور میں
گردشِ ماہ و سال میں گم ہوں

اقبال نے قوم کو جگایا یا قوم نے اقبال کو۔ یہ لطیف نکتہ ایک طرف رکھتے ہوئے سوال یہ اُبھرتا ہے کہ اتنی تگ و دَو سے جگائی جانے والی قوم اِتنی جلدی سو کیسے گئی؟ اقبال شناسی ہمارے ہاں چند ناقدین کے حلقے سے نکل کر عوام تک کیوں نہیں پہنچی؟ ہماری بجائے اقبال کا فکر اب قوم کے شعور کے افق پر اپنی آب و تاب سے کیوں چمک رہا ہے؟ فرق یہ ہے کہ ایرانی قوم بحیثیت قوم ایک سفر طے کر چکی تھی لیکن ہم تقسیم سے پہلے بھی ایک ہجوم تھے، تقسیم کے بعد بھی ہجوم ہی ہیں اور ہجوم پر فکر اقبال تو دور کی بات ہے، آسمانی صحیفوں کا اثر بھی کم کم دیکھنے کو ملا ہے۔ بے داری اور خواب کی آنکھ مچولی کا احساس اشرف نقوی کے ہاں یوں ملتا ہے:

شب بھر کیا کشید سحر کی امید کو
حجرے میں صبح ہوتے ہی جا کر میں سو گیا

ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق ''جن لوگوں نے قوم کی تقدیر بدلنا تھی، اُنھیں پاکستانی سیاست سے بڑی چالاکی کے ساتھ جدا کر دیا گیا، یعنی طالبِ علم اور مزدور تعلیمی اداروں میں طلباء یونینز

اور فیکٹریوں میں مزدور یونینز پر پابندی لگا دی گئی تاکہ قوم انقلابی بننے کی بجائے صبر و رضا سے رہنا سیکھ لے۔

داستاں گو نے مجھ کو رکھا ہے
میری ہی داستان سے باہر
جو لوگ مرکزی کردار تھے کہانی کے
نکل کے خود ہی پسِ داستاں چلے گئے ہیں

اِس رُکے ہوئے سفر میں کچھ بھی واضح نہیں۔ مذہب کے نام پر لیا گیا ملک کون سی فقہ کے تحت چلے؟ کیا ملک مذہب کے نام پر لیا گیا تھا یا فقہ کے نام پر؟ کون سا سیاسی ڈھانچہ بنایا جائے۔ 'Modern Western Politics' یا خلافت کی طرز؟ خلافت میں کون سا نظام بروئے کار لایا جائے؟ رائے شماری، نامزدگی، شُورائی طرز، ریفرینڈم یا پھر ملوکیت۔ ہوا کہیں اور چلتی اور سمت ہماری بدلتی ہے۔ایک قائد کے فقدان کا معروف درد اشرف نقوی کے ہاں یوں دکھائی دیتا ہے:

کوئی بھی عکس باعثِ حیرت نہیں رہا
گردِش میں آئینوں کا ستارہ ہے اِن دِنوں

اِس گھبراہٹ کے عالم میں اشرف نقوی کبھی کبھی یوں بھی گویا ہوتے ہیں جیسے آدم خواب میں ہابیل کا لہو میں تر جنازہ دیکھ کر اُٹھ پڑے تھے۔

اِک اِسمِ خاص کی یہ پڑھائی کا وقت ہے
سب مل کے دو دُہائی ، دُہائی کا وقت ہے

وہ ذمہ داری جو گزشتہ نسلوں سے پوری نہ ہوئی اس بستی کے لیے بھی میر صاحب کے بھاری پتھر اُٹھانے سے کم نہیں۔ دیکھیں تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ سمندر کے کنارے ڈوبتے سورج کا منظر دیکھ رہا ہو۔جس کے بعد سمندر میں اُترنا طے ہو چکا ہو جو ناصر کاظمی کے ہاں ہجرت کے نام سے جانا جاتا ہے، اشرف نقوی

کے ہاں اس درد کو 'Disilleesionea Pain' کہا جا سکتا ہے۔

رات بھی باقی ، دیا بھی بجھ گیا
نامکمل داستاں ہے اور میں

وہ نسل کہ جس کا اپنے ماضی پر سے اعتماد اُٹھ چکا ہو، وہ اپنے زیریں عہد سے بھی بددل نظر آتی ہے۔

یاد رکھنا تمھیں اب تو ممکن نہیں
میری جانب سے اے رفتگاں معذرت

مالک ! مِرے وطن کی ضرورت حسینؑ ہے
یہ مُلک بنتا جائے ہے میدانِ کربلا

مگر دُعا کے ساتھ فرد کی آزادی اور اس کے عمل کے بھی قائل ہیں۔ یوں میر اور قدر کے اتصال سے تقدیر کا رُخ بدل سکتا ہے۔

اے اہلِ شوق نکلو گھروں سے ، یہ وقت تو
دشتِ جنوں میں آبلہ پائی کا وقت ہے

حسرت و یاس کی دُھند میں امید ہی مونسِ جاں ہونے کے ساتھ ساتھ چراغِ راہ ٹھہرتی رہی ہے۔ وہ انقلاب دیر پا ہوتا ہے جو فرد کی سوچ سے شروع ہو کر قوم کے اجتماعی شعور تک پہنچے۔ ایک دم آنے والے انقلاب نہیں ہوا کرتے۔ ایسے حادثات تاریخ کی ضخیم کتابوں کے مضبوط تابوتوں میں سو رہے ہیں۔ اشرف نقوی کا فرد نطفے کے خراب سے جنم نہیں لیتا۔ وہ سلسلہ وار تعمیری مرحلوں سے گزرا ہوا دِکھائی دیتا ہے۔

تاریکیوں سے لڑتے ہوئے اِک چراغ نے

سورج کا اہتمام کیا اور چپ رہا

غالبؔ نے غزل کی تنگ دامنی کی شکایت کی تھی لیکن اُنھوں نے اِس صنف پر کوئی حملہ نہیں کیا مگر اُن کے شاگردِ رشید مولانا حالیؔ اس کے پیچھے پڑ کر ''محترم'' بن گئے۔ آگے چل کر عظمت اللہ خان، نظم طباطبائی، کلیم الدین احمد، عندلیب شادانی وغیرہ نے اعتراضات کرتے ہوئے اس صنف کے ساتھ بُرا سلوک کیا۔

بیسویں صدی کے آخر میں غزل کی دُنیا میں ایک تجربہ ظفر اقبال نے بھی کیا۔ اُنھوں نے اپنے شعری مجموعہ ''آبِ رواں'' میں غزل کے رنگ کو بدل کر پیش کیا۔ یہ تجربہ غزل کو ڈی کنسٹرکشن کرنے والا تھا جو ''اینٹی غزل'' کے روپ میں ہوا۔ اس کے علاوہ مظہر امام، مناظر عاشق ہرگانوی وغیرہ نے ہیئت کے تجربے بھی کیے اور مصرعوں کو توڑ مروڑ کر ''آزاد غزل'' کا نام دیا مگر وہ تجربے کامیاب نہ ہو سکے۔

اِن حملوں اور تجربوں کے باوجود اِس صنف کی شعری صورت اور ہیئت میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی نہ اس کی مقبولیت میں کمی آئی اور نہ ایک مقام پر رُک سکی بلکہ اپنے سالم روپ میں برقرار رہی ۔موضوعاتی اعتبار سے اپنے عہد کی ترجمانی میں خلوص اور دیانت داری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ ممتاز، منفرد اور ہر دلعزیز رہی اور اُردو شاعری کی آبرو بن کر رہی۔

اشرف نقوی کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ شاعری نہ تو ترقی پسندی کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور نہ ہی جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی محتاج ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کسی ایک مخصوص نظریے کی تبلیغ سے ادب وقت سے پہلے مر جاتا ہے۔ اس لیے اشرف نقوی نہ صرف کسانوں اور مزدوروں کی مجبوری و بے بسی کے گیت گانے پر اکتفا کرتے ہیں، نہ انقلاب کے ڈھنڈورچی بن کر نعرہ بازی پر اُتر تے ہیں، نہ رومانیت کے شیدائی ہیں، نہ وصل، ہجر اور انتظار کا مثلث بناتے ہیں، نہ عاشق، معشوق اور رقیب کا تکون، نہ معشوق کے گھر کا طواف کرنے کے عادی ہیں، نہ کسی کے قصیدے گانے میں جُٹے

ہوئے ہیں۔ اشرف نقوی نہ فرسودہ جمالیاتی اورفکری امتزاجی کیفیت اوراس سے رونما ہونے والے حالات کے قصے بیان کرنے میں اپنا وقت گزارتے ہیں، نہ حالات کا رونا روتے ہیں اور نہ ہی کسی طرح کی گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ وہ فرد کی تنہائی کی بات نہیں کرتے اور وہ فلسفۂ وجودیت کے پیچھے پڑ کر اپنا سر نہیں کھپاتے۔ وہ مذہب سے کھلواڑ نہیں کرتے۔ انھیں معلوم ہے کہ پوری دُنیا ایک گلوبل ویلیج میں بدل چکی ہے۔ اِس لیے وہ جو زندگی دیکھ رہے ہیں اور جھیل رہے ہیں اسے اپنی غزلوں میں پیش کرر ہے ہیں۔

سب زمانی اور مکانی مختلف
ہر کسی کی ہے کہانی مختلف
آنکھ اور دریا کا رِشتہ مُنفرد
اور دونوں کی روانی مختلف
رائیگاں ہوتے ہوئے اِس دَور کی
ہو رہی ہے رائیگانی مختلف

اشرف نقوی کی شاعری کے تناظر میں عصری حسیت کے ساتھ ساتھ تخلیقی وفور اور موضوعات کو تنوع دیکھا جا سکتا ہے۔ جذبہ وخیال میں شِدت محسوس کی جاسکتی ہے اور انفرادی شناخت بھی پائی جاسکتی ہے۔ اشرف نقوی کو اپنی علمیت اور تخلیقیت پر پورا اعتماد ہے۔ ہمارے بڑے اور نام ور تنقید نگاروں کی نظریں جب بھی اُٹھتی ہیں تو صرف اپنے ماضی کے اساتذۂ سخن یا اپنے ہی گروہ کے معاصر فن کاروں پر۔ یہ بات صد فیصد درست ہے کہ ہم اسلاف اور اُن کی غزلیہ شاعری کو ہی آئیڈیل مانتے ہیں اور ماننا بھی چاہیے لیکن ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ ماضی کے جتنے بھی شعراء تھے سب کے سب ہمہ وقتی اور پیشہ ور شاعر تھے۔

دورِ حاضر کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ زندگی تناؤ کا شکار ہو چکی ہے۔ مقامی سطح سے لے

کر عالمی سطح پر امن وسکون اور زندگی کی بقا و بحالی کے لیے کئی جتن کیے جا رہے ہیں۔ اِسی لیے آج دُنیا بھر میں کبھی یومِ مادر، یومِ پدر، یومِ اطفال، یومِ خواتین، یومِ اساتذہ، یومِ امن، یومِ ماحولیات و غیرہ وغیرہ منا کر سب کی توجہ مرکوز کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اِس طرح سال کے 365 دنوں میں سے اکثر ایّام کسی نہ کسی خصوصی دن سے منسوب ہو گئے۔ اس کے باوجود روزانہ نت نئے مسائل اور تنازعات اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

اشرف نقوی کا شمار علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف و تعریف کا محتاج نہیں کہ ''آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی'' ہُوا کرتی ہے۔'' بادِ بہاری کے مصداق ان کا شمار شیخوپورہ اور لاہور سمیت ملک کے نامور شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کے رشحاتِ قلم کو اہلِ علم نے ہمیشہ اسلوبِ نگارش کی تازہ کاری و مرصّع کاری، اُستاد کی اصابت، فکر کی رفعت، خیالات کی بلندی اور فن کی پختگی کی بنا پر قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

اشرف نقوی ذوق وشوقِ تشہیر سے نا آشنا، صلے و ستائش کی تمنا سے بے نیاز ہو کر ہمہ وقت گلستانِ ادب کی خونِ جگر سے آبیاری میں منہمک رہتے ہیں۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے سخن شناس اور سخن فہم ہیں۔ اشرف نقوی قدیم و جدید شعری آہنگ سے واقف ہیں۔ وہ نام کے ہی اشرف نہیں بلکہ ذات میں بھی اشرف ہیں۔ وہ اپنے اِس کام اور محنت سے علم و ادب میں کامیابی سے سفر طے کر رہے ہیں اور آگے بھی اللہ اُن کو کامیاب کرے۔ آخر میں اشرف نقوی کا کچھ کلام جو کہ ادبی حلقوں میں نہایت شہرت کا حامل ہے رہا ہے:

غزلیں

جاگتا ہوں کہ سو رہا ہوں میں
منکشف خود پہ ہو رہا ہوں میں

میری آنکھوں میں یہ جو پانی ہے
اِس میں دُنیا ڈبو رہا ہوں میں

اِس سے پیکر بناؤں گا اپنا
یہ جو مٹی بھگو رہا ہوں میں

میرے اندر جو ایک صحرا ہے
اُسی صحرا میں کھو رہا ہوں میں

جو ستارہ نہیں رہا میرا
اُس ستارے کا ہو رہا ہوں میں

زندگانی کے نام پر اشرفؔ
بوجھ یہ کس کا ڈھو رہا ہوں میں

ہجر سے جو ملا کے رکھا ہے
غم وہ جگنو بنا کے رکھا ہے

تیری راہوں میں اِک دِیا ہی نہیں
ہم نے دل بھی جلا کے رکھا ہے

خشک آنکھوں کی اوٹ میں ہم نے
اِک سمندر چھپا کے رکھا ہے

آنکھ میں جو کبھی نہیں اُترا
خواب وہ بھی بچا کے رکھا ہے

وقت کو بھی کتاب میں ہم نے
مور کا پر بنا کے رکھا ہے

ہم نے دشتِ حیات میں اشرف
ہر قدم مسکرا کے رکھا ہے

یہ جو آنکھوں میں نم ادھورا ہے
سچ تو یہ ہے کہ غم ادھورا ہے

زندگی زندگی نہیں لگتی
آ رہا ہے جو دم اُدھورا ہے

اے خدا! پھر سے اِک صدائے کُن
میرا ہر زیر و بم ادھورا ہے

زیست میں ہے کوئی ادھورا پن
ہے بہت پھر بھی کم ادھورا ہے

منزلوں کا سراغ پانے تک
آپ کا ہر قدم ادھورا ہے

عشق اشرف نہ گر کسی سے ہو
دشتِ وحشت میں رَم ادھورا ہے

لمحہ لمحہ گزاتی ہے مجھے
زندگی یوں بھی مارتی ہے مجھے

دُور خود سے میں جب بھی ہوتا ہوں
میری مٹی پکارتی ہے مجھے

عکس ہوں میں ، تُو میرا آئینہ
تیری حیرت سنوارتی ہے مجھے

شبِ تنہائی اور یاد تِری
اِک غزل پر اُبھارتی ہے مجھے

ہجرت و ہجر کی فراوانی
زندہ رکھتی نہ مارتی ہے مجھے

رنج ہوتا ہے ناؤ کو اشرفؔ
جب بھنور میں اُتارتی ہے مجھے

حوالہ جات

۱) قاسم سہانی، ''زادِحرف، اشرف نقوی کی منفرد شاعری، روزنامہ'' آغازِ سفر، ملتان، ۱۲ جولائی ۲۰۱۵ء

۲) ادبی ایڈیشن، روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور، ۲۲ نومبر ۲۰۰۶ء

۳) سرور ارمان، تاثرات، ''زادِحرف'' روزنامہ ''نئی بات''، لاہور ۱۹ اپریل ۲۰۱۵ء

۴) اشفاق احمد ورک ڈاکٹر، ''قلمی دشمنی''، روزنامہ ''الجریدہ'' لاہور، ادارتی صفحہ، ۱۸ اپریل ۲۰۰۷ء

۵) مظفر علی خاں ''اُردو اور پنجابی کے غزل گو شاعر، اشرف نقوی''، ادبی ایڈیشن روزنامہ ''جناح لاہور ۲ جون ۲۰۱۲ء

۶) خالد فتح محمد، تبصرہ ''آخرش''، سہ ماہی ''ادراک''، گوجرانوالہ، اپریل تا جون ۲۰۰۷ء

۷) شبہ طراز، تبصرہ ''آخرش''، سہ ماہی ''تجدیدِ نَو''، لاہور، اپریل تا جون ۲۰۰۷ء ص ۲۴۰

۸) تبصرہ ''زادِحرف''، ماہنامہ ''فانوس'' لاہور، اکتوبر ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۸

۹) تبصرہ ''آخرش''، سہ ماہی ''عقیدت''، سرگودھا، ستمبر تا نومبر ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۶

۱۰) صائمہ نفیس، ''تبصرہ ''آخرش''، ماہنامہ ''دُنیائے ادب''، کراچی، جولائی ۲۰۰۶ء، ص ۴۶

۱۱) محمد اکرم سرا ڈاکٹر، ''اور جانا گھر میں اشرف نقوی کے''، ماہنامہ ''ادب دوست'' لاہور، جنوری ۲۰۱۸ء ص ۴۸

۱۲) وحید احمد زمان، ''اشرف نقوی کی شاعری پر ایک نظر''، ماہنامہ ''فرسٹ آپشن'' لاہور، دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۵۶

۱۳) تصوّر اقبال، ''تبصرہ کتب''، ماہنامہ ''نیرنگِ خیال''، راولپنڈی، دسمبر ۲۰۰۶ء، ص ۶۰

۱۴) ارشد نعیم، ''اشرف نقوی اور زادِحرف''، ماہنامہ ادب دوست، لاہور، ستمبر ۲۰۱۵ء، ص ۳۵

۱۵) محمود اختر خان، ''اشرف نقوی، میر کی شعری روایت کا امین''، ماہنامہ ''ادب دوست'' لاہور، اگست ۲۰۱۹ء، ص

۱۶) شاہین عباس، دیباچہ ''آخرش''، ''اے مخاطب''، ۲۰۰۶ء ص ۹

۱۷) ضیاء الحسن ڈاکٹر، ''اشرف نقوی کا استعاراتی نظام''، ''زادِحرف''، ص ۱۳

۱۸) اخبارِ جہاں کراچی، ۲۴ نومبر تا ۳۰ نومبر ۲۰۰۳ء، ص ۴۳

۱۹) ندیم گلانی، ''سیّد محمد اشرف نقوی کے ساتھ انٹرویو''، گوشہ ادب ''پارلیمان نیوز'' اسلام آباد، ۳۰ جون ۲۰۱۵ء

۲۰) اشرف نقوی، ''آخرش''، بیت الحکمت لاہور، ۲۰۰۶

۲۱) اشرف نقوی، ’’زادِحرف‘‘، انحراف پبلی کیشنز، لاہور، جون ۲۰۱۵ء

کتابیات

۱) ماہنامہ ''تخلیقات''، ستمبر ۱۹۹۹ء

۲) سہ ماہی ''کاروان'' بہاول پور، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء

۳) روز نامہ ''الجریدہ'' لاہور، ۱۸ اپریل ۲۰۰۷ء

۴) سہ ماہی ''کاروان'' بہاول پور، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۱ء

۵) ''عکاس'' انٹرنیشنل اسلام آباد، کتاب نمبر ۲۶، مئی ۲۰۱۷ء

۶) پندرہ روزہ ''روشنی'' پشاور، ستمبر ۲۰۰۲ء

۷) ''عالمی رنگِ ادب'' کراچی سلسلہ ۳۰،۳۱،

۸) روز نامہ ''نوائے وقت'' لاہور، ۲۲ نومبر ۲۰۰۶ء

۹) اخبارِ جہاں کراچی، ۲۴ تا ۳۰ نومبر ۲۰۰۳ء

۱۰) اشرف نقوی، ''آخرش''، بیت الحکمت لاہور، ۲۰۰۶ء

۱۱) اشرف نقوی، ''زادِ حرف''، انحراف پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء

۱۲) ماہنامہ ''ادب دوست'' لاہور، ستمبر ۲۰۱۵ء

۱۳) ''عالمی رنگِ ادب'' کراچی، سلسلہ نمبر ۳۰۔۳۱

۱۴) ادبی ایڈیشن روز نامہ ''نوائے وقت'' لاہور، ۲۰۰۵ء

۱۵) روز نامہ ''خبریں'' لاہور، ۲۵ اگست ۲۰۰۲ء

۱۶) ''قلمی دُشمنی''، روز نامہ ''الجریدہ'' لاہور، ۱۸ اپریل ۲۰۰۷ء

۱۷) انٹرویو اشرف نقوی بمقام رہائش گاہ اشرف نقوی، ۲۱ جولائی ۲۰۱۹ء

۱۸) ماہنامہ ''بیاض'' لاہور، مارچ س ن

۱۹) ماہنامہ ''غنیمت'' لاہور، جولائی اگست ۲۰۰۲ء

۲۰) ماہنامہ ''ادب دوست'' لاہور، جون ۲۰۰۸ء

۲۱) ہفت روزہ ''نائب اللہ'' شیخوپورہ

۲۲) ہفت روزہ ''نائب اللہ'' شیخوپورہ''، ۲۰ تا ۲۶ نومبر ۲۰۰۶ء

۲۳) ماہنامہ ''نیرنگِ خیال'' راول پنڈی، دسمبر ۲۰۰۶ء

۲۴) ماہنامہ ''ادب دوست'' لاہور، ستمبر 2015ء

۲۵) ماہنامہ ''فانوس'' لاہور، اکتوبر ۲۰۱۵ء

۲۶) سہ ماہی ''عقیدت''، ستمبر تا نومبر ۲۰۰۷ء

۲۷) سہ ماہی ''ادراک'' گوجرانوالہ اپریل تا جون ۲۰۰۷ء

۲۸) روز نامہ ''نوائے وقت''، لاہور (ادبی ایڈیشن) ۲۴ اگست ۲۰۰۱ء

۲۹) سمیعہ نعیم، ''شیخوپورہ کی ادبی تنظیم ''دریچہ'' کی علمی وادبی خدمات'' (مقالہ ایم فل) جی سی یونیورسٹی فیصل آباد، ۲۰۱۷ء

۳۰) سمیعہ نعیم، ''شیخوپورہ کی ادبی تنظیم ''دریچہ'' کی علمی وادبی خدمات''

۳۱) سرورالہدیٰ ڈاکٹر، ''نئی اُردو غزل''، بیکن بکس ملتان، ۲۰۱۵ء

۳۲) سرورالہدیٰ ڈاکٹر، ''نئی اُردو غزل''

۳۳) روز نامہ ''نئی بات'' لاہور (ادبی ایڈیشن) ۱۹ اپریل ۲۰۱۵ء

۳۴) سرورالہدیٰ ڈاکٹر، ''نئی اُردو غزل'' بیکن بکس ملتان ۲۰۱۵ء

۳۵) سہ ماہی ''تجدیدِ نو'' لاہور اپریل تا جون، ۲۰۰۷ء

۳۶) ماہنامہ ''دُنیائے ادب'' کراچی، جولائی ۲۰۰۹ء

۳۷) عبادت بریلوی، ''جدید شاعری'' علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۳ء

۳۸) ''مرغزار'' مجلہ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج شیخوپورہ، شمارہ نمبر ۱۸، ۲۰۱۷ء

۳۹) روز نامہ ''آغازِ سفر'' ملتان، ۱۲ جولائی ۲۰۱۵ء

۴۰) ماہنامہ ''ادب دوست'' لاہور، اگست ۲۰۱۹ء

۴۱) ماہنامہ ''ادب دوست'' لاہور جنوری ۲۰۱۸ء

۴۲) ادبی ایڈیشن روز نامہ ''جناح'' لاہور ۲ جون ۲۰۱۲ء

۴۳) ماہنامہ ''شام وسحر'' لاہور، فروری ۲۰۰۳ء

۴۴) محمد نعیم خان، ''شیخوپورہ کی ادبی روایت میں ارشد نعیم کا کردار'' (مقالہ ایم فل) منہاج یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۵ء

۴۵) محمد نعیم خان، ''شیخوپورہ کی ادبی روایت میں ارشد نعیم کا کردار'' مقالہ ایم فل، منہاج یونیورسٹی

۴۶) سہ ماہی ''عقیدت'' سرگودھا، ستمبر تا نومبر ۲۰۰۷ء

۴۷) روزنامہ ''پارلیمان نیوز'' (گوشۂ ادب)، اسلام آباد، ۳۰ جون ۲۰۱۵ء

۴۸) مظہر علی ورک، ''اشرف نقوی، حیات و خدمات''، مقالہ برائے ایم فل، علامہ اقبال یونیورسٹی اسلام آباد، سال ۲۰۱۸ء

۴۹) ماہنامہ ''فرسٹ آپشن'' لاہور، دسمبر ۲۰۰۶ء

۵۰) ہفت روزہ ''نائب اللہ'' شیخوپورہ ۲۰ تا ۳۰ نومبر ۲۰۰۶ء